DALE CARNEGIE

مانیں نہ مانیں

ڈیل کارنیگی

DALE CARNEGIE

مانیں نہ مانیں

ڈیل کارنیگی

ناشران

بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری
بک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 0544-614977
فون نمبر 0544-621953
موبائل 0323-5777931
موبائل 0321-5440882

ویب سائٹ www.bookcorner.com.pk ای میل info@bookcorner.com.pk

فہرست

"میرے خیال میں بڑا راز آج کا دِن ہے"

ڈیل کارنیگی

کچھ مصنف کے بارے میں

ڈیل کارنیگی 24 نومبر 1888ء میں مسوری امریکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا مکمل نام ڈیل بریکن ریج کارنیگی (Dale Breckenridge Carnegie) ہے۔ آپ نے وارنسبرگ سٹیٹ ٹیچرز کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ایک منجھے ہوئے سیلز مین اور معروف اُداکار کے طور پر آپ نیویارک جاتے اور YMCA کے ارکان کو کمیونی کیشنز کی تعلیم دیتے۔ 1912ء میں بین الاقوامی سطح پر "ڈیل کارنیگی کورس" کا آغاز کیا۔ آپ نے کئی شہرۂ آفاق کتابیں تحریر کیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1913: Public Speaking and Influencing Men In Business.
An introduction to public speaking.

1926: How to Develop Self-Confidence and People by Public Speaking

1932: Lincoln the Unknown.
A biography of Abraham Lincoln.

1936: How to Win Friends and Influence People.
A self-help book about interpersonal relations and how to succeed.

1946: Five Minute Biographies

1944: How to Stop Worrying and Start Living.
A self-help book about stress management.

1962: The Quick and Easy Way to Effective Speaking

1964: How to Enjoy Your Life and Your Job
Selections from the Dale Canrgie's Bestselling books.

ڈیل کارنیگی کی کتابوں کے اُردو تراجم بک کارنر شوروم کے پلیٹ فارم سے شائع ہوئے۔جن کے نام قابل ذکر ہیں:

☆ پریشان ہونا چھوڑیئے جینا سیکھئے!
☆ میٹھے بول میں جادو ہے
☆ گفتگو تقریر ایک فن
☆ خود اعتمادی بڑھایئے!
☆ کامیاب لوگوں کی دِلچسپ باتیں
☆ 39 بڑے آدمی
☆ مانیں نہ مانیں

ڈیل کارنیگی کی کتابوں کی 6 کروڑ سے زائد کاپیاں دُنیا کی 38 زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔مسٹر کارنیگی اپنے وقت کے ممتاز لیکچرار اور کئی عالمی لیڈروں کے پسندیدہ مشیر بھی تھے۔آپ کئی اخبارات میں کالم لکھتے اور ریڈیو پر روزانہ اپنا شو براڈ کاسٹ کیا کرتے تھے۔ڈیل کارنیگی کا قائم کردہ نیٹ ورک آج دُنیا کے ستر سے زائد ممالک میں پھیل چکا ہے اور اس میں تین ہزار سے زائد انسٹرکٹرز شامل ہیں۔

ڈیل کارنیگی کی سب سے شہرۂ آفاق کتاب ''پریشان ہونا چھوڑیئے جینا سیکھئے'' کی دُنیا کی تمام بڑی زبانوں میں کروڑوں تعداد میں اَن گنت کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں جسے پڑھ کر کروڑوں افراد پریشان رہنے کی عادت پر قابو پا چکے ہیں۔اِس کتاب میں ڈیل کارنیگی اُن عملی اُصولوں کا ایک مجموعہ پیش کرتے ہیں جو آج اکیسویں صدی کی برق رفتار دُنیا میں بھی قابل عمل ہے۔یہ اُصول عمر کے ہر حصے میں فائدہ پہنچانے والے ہیں۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں محض ۵ ہزار کے قلیل ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوئی۔اس کتاب کے پبلشر ''سائمن اینڈ شسٹر'' اور نہ ہی ڈیل کارنیگی کو اس سے زیادہ فروخت ہونے کی توقع تھی لیکن وہ اس وقت حیران رہ گئے جب اس کتاب نے راتوں رات کچھ یوں مقبولیت حاصل کی کہ پریس کو عوام کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لئے اس کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن چھاپنے پڑ گئے اور اس کتاب نے پریس کی تاریخ میں

بیسٹ سیلر کا اعزاز حاصل کر لیا۔یہ کتاب دلوں کو چھو لیتی اور تشنہ کام انسانی آرزوؤں کو سیر اب کرتی تھی جو کہ ان بے کیف و غمگین دنوں میں ایک عجیب بات تھی اور اس بات کا ثبوت گزشتہ پچاس سال سے اس کی مسلسل اِشاعت ہے۔

دُنیا بھر میں کروڑوں لوگ ڈیل کارنیگی کی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں اور ان کے بتائے ہوئے اصولوں سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کو نہایت خوشگوار اور پُرسکون بنائے ہوئے ہیں۔ان کی کتاب ''میٹھے بول میں جادو ہے'' اَب تک 16 کروڑ سے زائد فروخت ہونے والی کتاب ہونے پر ورلڈ ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔

ڈیل کارنیگی کا انتقال 66 سال کی عمر میں مرض ہاجکن میں لاحق ہونے سے ہوا۔انہیں یکم نومبر 1955ء کو فارسٹ ہلز نیویارک امریکہ میں دفن کیا گیا۔

سیّد علی عمران جلالپوری

اپٹون سنگلیر

اس کی کتابیں دنیا کی اتنی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں کہ ان میں سے اکثر کے نام اسے خود بھی نہیں آتے۔

اپٹون سنگلیر نے پانچ سو سے زیادہ پمفلٹس اور اڑتالیس کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی کتابوں کی تیس لاکھ جلدیں روس میں جبکہ بیس لاکھ جلدیں جرمنی میں فروخت کی جا چکی ہیں۔ اس کے اصلاح پر مبنی ناولوں نے روس کے انقلاب میں مدد کی ہے۔ حالانکہ وہ ایک امریکن تھا، لیکن بجائے امریکہ کے اس کی کتب یورپ میں زیادہ مقبول ہیں۔ میں ایک روز فرنچ ریویرا میں ایک بک سٹال پر گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ اپٹون سنگلیر کی کتابیں دوسرے تمام امریکی اور انگریز ادیبوں سے زیادہ ہیں۔ چوالیس زبانوں میں اس کی کتابوں کا ترجمہ کیا جا چکا ہے۔ اپٹون سنگلیر نے ایک مرتبہ مجھے بتایا کہ ان میں سے کئی زبانوں سے وہ خود بھی ناواقف تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ زبانیں کن ملکوں کی ہیں۔ موجودہ دَور میں اس کی کتابیں دوسرے تمام مصنّفین سے زیادہ پسند کی جاتی ہیں۔

سنگلیر نے سولہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا اور ساٹھ سال کی عمر تک وہ مسلسل لکھتا رہا۔ اس نے لاکھوں کی تعداد میں صفحات لکھے ہیں۔ اس نے اتنے زیادہ الفاظ رقم کئے ہیں کہ اگر پرانی اور نئی دونوں بائبلوں کو ملایا جائے تو ان سے بھی اس کے الفاظ زیادہ ہیں۔

اپٹون سنگلیر کے سامنے ایک واضح مقصد تھا۔ وہ دنیا سے افلاس کے خاتمے کا

خواہشمند تھا، کیونکہ اسے تجربہ تھا کہ مفلسی کس قدر بے رحم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسے دَور سے بھی گزر چکا ہے کہ جس میں وہ مسلسل چھ سال تک مفلسی کا شکار رہا۔

اس کا باپ شراب بیچتا تھا اور خود بھی بہت بڑا شرابی تھا۔ جب وہ لڑکا تھا تو اپنے باپ کی تلاش میں ایک سے دوسرے شراب خانے میں گھومتا اور پھر اپنے شرابی باپ کو کسی شراب خانے سے اپنے بازوؤں کے سہارے آہستہ آہستہ گھر لا کر اسے اس کے بستر پر لٹا دیتا۔ اس کی ماں اپنے شرابی شوہر کی جیبوں کو ٹٹولتی اور تمام نقدی نکال کر چھپا لیتی تاکہ اگلے روز اس نقدی سے کھانا وغیرہ پکا سکے۔ وہ اتنے غریب تھے کہ ٹوٹے پھوٹے اور اندھیرے مکانوں میں رہتے تھے اور مسلسل مکان تبدیل کرتے رہتے تھے، کیونکہ وہ مکان کا کرایہ نہیں دے پاتے تھے۔ اپٹون سنگلیر بڑا ہوا تو شراب کا سخت مخالف ہو گیا۔ وہ گھنٹوں شراب کے خلاف لیکچر دیتا رہتا۔ سنگلیر پر اپنے باپ کی زندگی کا یہ اثر ہوا کہ وہ بڑا ہو کر چائے تک نہ پیتا تھا اور نہ ہی کبھی اس نے سگریٹ کو ہاتھ لگایا تھا۔

دس سال کی عمر سے قبل اسے سکول جانے کا موقع نہ مل سکا۔ پڑھنا اس نے خود ہی سیکھا تھا، سکول جانے سے قبل اس نے بہت سارے مشہور انگریزی ناول نگاروں کے کئی ناول پڑھ ڈالے تھے اور اسی طرح اس نے انسائیکلوپیڈیا کا ایک حصہ بھی یاد کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ہائی سکول کی تعلیم دو سال میں ختم کر لی۔

جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اس کے پاس ایک دھیلا بھی نہ تھا۔ اس کی ماں اس کے ساتھ رہتی تھی اور اس کا سارا خرچہ سنگلیر ہی اٹھاتا تھا۔ چنانچہ اس نے سات قسم کے مختلف رسالوں کے لئے ناول اور کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ اس طرح وہ اپنے اور کالج کے اخراجات پورے کرنے لگا۔ ہر رات وہ ایک کہانی یا ناول کا ایک باب لکھتا۔ وہ دو ناول ایک ماہ میں مکمل کر لیتا۔ علاوہ ازیں اسے یونیورسٹی میں آٹھ گھنٹے تعلیم بھی حاصل کرنا ہوتی تھی۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ لاکھوں آدمیوں میں سے صرف ایک دو ہی اس قدر کام کر سکتے ہیں۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد وہ بچوں کے رسالوں کے لئے مختلف قسم کی کہانیاں لکھ کر چودہ پونڈ فی ہفتہ کمانے لگا۔ اس وقت وہ بیس سال سے کم عمر کا تھا اور یہ آمدنی اس کے لئے ضرورت سے زیادہ تھی۔ لیکن اپٹون سنگلیر پیسوں کے لئے کہانیاں اور ناول

نہیں لکھتا تھا۔ اس کے اندر ایک شدید جذبہ موجزن تھا۔ وہ ناانصافی اور مفلسی کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ اپنے اسی جذبے کے تحت وہ اپنی بیمار بیوی، بیمار بچے اور ساری آمدنی چھوڑ کر نیو جرسی چلا گیا اور وہاں ایک خیمہ لگا کر مفلسی اور ناانصافی کے خلاف پروپیگنڈا ناول لکھنے لگا۔ ایسے ناول جو دنیا کی اصلاح کر دیں۔ وہ وہاں پانچ سال رہا اور اس عرصے میں اس نے پانچ ناول لکھے۔ ان پانچ ناولوں سے اس نے پانچ سال میں صرف دو سو پونڈ کمائے۔ بالفاظ دیگر چالیس پونڈ سالانہ یعنی روز کے ڈھائی شلنگ۔

وہ اکثر مسلسل بھوکا رہا۔ ایک دن اس کی بیوی دکان سے ایک میز پوش خرید لائی۔ لیکن جب اسے اس کی فضول خرچی کا پتہ چلا تو اس نے اسے میز پوش فوراً واپس کرنے کے لئے کہا۔ وہ میز پوش ڈھائی شلنگ کا تھا۔ ان ڈھائی شلنگ سے دو دن کا کھانا بخوبی چل سکتا تھا۔

اس کے چھٹے ناول کا نام ''جنگل'' تھا۔ اس ناول نے ایک سنسنی پیدا کر دی اور اسے اس کا چھ ہزار پونڈ معاوضہ ملا۔ مگر اس نے یہ سارا پیسہ نیو جرسی میں دریائے ہڈسن کے کنارے ایک ایسی بستی کی تعمیر پر صرف کر دیا جو ادیبوں، آرٹسٹوں اور موسیقاروں کے لیے مخصوص تھی اور جہاں ان کو اشیائے ضرورت سستی مل سکتی تھیں۔ سنکلیر کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ اس کے پیچھے اس طرح بھاگتا جیسے بلی کے پیچھے بلڈاگ بھاگتا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ اس نے وائلن سیکھنے کا ارادہ کیا۔ وہ روزانہ آٹھ گھنٹے وائلن بجاتا اور تین سال مسلسل بجاتا رہا۔ جب اس کے ہمسایوں نے اعتراض کیا تو وہ اپنے وائلن کے ساتھ جنگل میں چلا گیا اور وہاں پرندوں اور چوپایوں کے سامنے پورا پورا دن وائلن بجاتا۔

اپٹون سنکلیر نے مجھے بتایا کہ وہ چار دفعہ قید کیا جا چکا ہے۔ پہلی دفعہ اس جرم کی پاداش میں اسے اٹھارہ گھنٹے قید کیا گیا کہ وہ اتوار کے روز ٹینس کھیل رہا تھا۔ دوسری دفعہ اسے تین دن تک اس لیے قید رکھا گیا کہ وہ نیویارک میں جون ڈی۔ راک فیلر کے دفتر کے سامنے خاموشی سے گھوم رہا تھا۔ تیسری مرتبہ اسے اس وجہ سے قید کیا گیا کہ اس نے بائبل کی ایک کاپی ایک سپاہی کو فروخت کی تھی۔ چوتھی دفعہ قید کئے جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دستور ایک باغ میں اس کے مالک کی اجازت کے بغیر پڑھ رہا تھا۔

الیگزینڈر ڈوما

اس نے بارہ سو کتابیں لکھیں اور اس بات پر
فخر کرتا تھا کہ وہ پانچ سو بچوں کا باپ ہے۔

سب سے زیادہ ہردلعزیز مہم جوئی کی کہانی کون سی ہے؟ ''رابنسن کروسو؟'' ''دون کنجوتے؟'' ''خزانے کا جزیرہ؟'' فطرتاً اس بارے میں ہم مختلف آراء رکھتے ہیں، لیکن میں صرف ''تین بندوقچی'' کے حق میں ووٹ ڈالوں گا۔

''تین بندوقچی'' کا شمار تقریباً ایک صدی سے سب سے زیادہ فروخت کی جانے والی کتابوں میں ہے۔ اس وقت بھی سینکڑوں لوگ درجنوں مختلف زبانوں میں اس ناول کو پڑھ رہے ہوں گے۔

ناول نویسوں میں ''تین بندوقچی'' کا مصنف الیگزینڈر ڈوما ایک عجوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے یہ شیخی بگھارنے میں بڑا لطف آتا تھا کہ وہ پانچ سو سے زیادہ بچوں کا باپ تھا۔ ممکن ہے اس نے یہ اندازہ لگاتے ہوئے کچھ زیادہ ہی رجائیت سے کام لیا ہو۔ لیکن اپنے موٹاپے اور بے تکے چہرے کے باوجود وہ عورتوں کو راغب کرنے کا گر جانتا تھا۔ اس نے کئی بار یہ دعویٰ کیا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ لیکن اس سلسلے میں اس کی لاف زنی کچھ بری طرح بڑھ گئی تھی اور ایک محبوبہ نے اس کی ساری اکڑ نکال دی۔ اس نے اپنے سرپرست سے کہا کہ وہ ڈوما کے سارے قرضے قرض خواہوں کو زیادہ رقم دے کر خرید لے۔ ان دنوں مقروض آدمی کو جیل بھیجا جا سکتا تھا۔ چنانچہ عظیم عاشق ڈوما کو شائستگی سے اطلاع کر

دی گئی کہ وہ ان دو میں سے ایک کا انتخاب کر لے......شادی کر لے یا جیل چلا جائے۔ڈوما نے شادی رچالی۔

ڈوما کی شکل وصورت بھی عجیب سی تھی۔اس کی رگوں میں تین چوتھائی خون گوروں کا تھا جبکہ ایک چوتھائی حبشیوں کا۔اس کی دادی جزائر غرب الہند میں گنے کے ایک فارم پر حبشن باندی کی حیثیت سے رہتی تھی۔اس کا نام میری ڈوما تھا۔اس غریب اور جاہل عورت نے گمنام زندگی گزاری اور ایسے ہی انتقال کیا۔اس بیچاری نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ اس کے پوتے کی شہریار اور شاعر اور امراء عزت وتکریم کریں گے اور وہ اس کا نام ساری دنیا میں روشن کرے گا۔

ڈوما اپنی حبشن دادی سے خاصا مشابہ تھا۔یوں تو اس کا رنگ گورا تھا اور آنکھیں جزائر غرب الہند کے آسمان جیسی نیلی تھیں۔مگر اس کے ہونٹ موٹے اور نتھنے چپٹے اور چوڑے تھے۔

اس نے تلواروں اور پستولوں سے مسلح ہو کر بیس دفعہ ڈوئل لڑے،اس کے بال ویسے تو گینڈے کی طرح زرد تھے لیکن بالکل اپنی حبشن دادی جیسے تھے یعنی گھنے اور گھونگھریالے تھے۔

خوش خوراک ہونے کی وجہ سے وہ ہر قسم کی چٹنی تیار کرنے یا مرغ وغیرہ بھوننے میں اتنا ہی مشہور تھا جتنا ناول لکھنے کی اہلیت میں۔وہ بیک وقت مچھلی کی کئی پلیٹیں،کئی بھنے ہوئے تیتر،نصف درجن کے قریب مختلف سبزیاں اور بہت سا پنیر کھا جاتا تھا۔جب وہ کھانے پر آتا تو اس قدر کھا جاتا کہ مشہور زمانہ پیٹو،سمارک اسے دیکھ لیتا تو شرمندہ ہو جاتا۔لیکن اپنی اس انتہا کے باوجود نہ تو اس نے کبھی شراب یا کافی چکھی اور نہ ہی کبھی سگریٹ پی تھی۔جب وہ لکھنے میں مصروف ہوتا تو اسے کھانے کی پرواہ بھی نہ ہوتی۔بعض اوقات تو کھانا کھانا بھی بھول جاتا۔جب وہ کام میں مصروف ہوتا اور کوئی دوست ملنے آ جاتا تو وہ صرف اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر اسے خوش آمدید کہتا اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔

لیکن وہ جس قسم کا کاغذ اور قلم استعمال کرتا تھا اس کے متعلق انتہائی جذباتی ہوتا مثلاً وہ ناول صرف نیلے کاغذ پر اور خاص قلم سے لکھا کرتا تھا۔شعر لکھتے ہوئے وہ زرد کاغذ اور

مختلف قسم کے قلم استعمال میں لاتا۔کسی رسالے کے لئے مضمون لکھتے ہوئے وہ گلابی کاغذ کے سوا اور کوئی کاغذ استعمال نہ کرتا۔اور حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں اس نے کبھی نیلی سیاہی استعمال نہیں کی تھی۔اسے نیلی سیاہی سے چڑ تھی۔اس نے کبھی میز پر بیٹھ کر ڈرامہ نہ لکھا تھا۔ڈرامہ لکھنے کیلئے وہ صوفے پر دراز ہو جاتا اور اپنی کہنی کے نیچے نرم تکیے رکھ لیتا۔

سب واہیات؟ جی ہاں!! لیکن اس سے قبل کہ آپ اس پر ہنسیں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اس نے زندگی میں کیا کیا،کیا؟ اس نے کوئی ایک سو ڈرامے،اتنے ہی ناول اور تاریخی کتابیں لکھیں۔آج جب اس کی تمام تخلیقات جمع کی گئیں تو وہ بارہ سو جلدیں بنیں۔ذرا سوچیں! بارہ سو جلدیں۔اگر جون گالزوردی،جارج برنارڈ شا،رابرٹ لیوس سٹیونسن، ایچ جی ویلز،رڈیارڈ کپلنگ،میری روبرٹس،اینی ہارٹ اور زین گرے،ان تمام مصنفین کی تخلیقات اکٹھی کر لی جائیں تو پھر بھی ڈوما نے ان سب سے دگنا لکھا ہے۔

اس نے دس لاکھ پونڈ سے زیادہ کمایا۔اپنے دور کے ہر مصنف سے زیادہ۔حقیقت میں ادبی تاریخ میں شاید ہی کسی مصنف نے اپنی نگارشات سے اتنا پیسہ کمایا ہو۔اس کے باوجود وہ اس قدر غریب تھا کہ جب اس کا پہلا ڈرامہ سٹیج پر چلنے والا تھا تو اس کے پاس اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنی قمیض کا نیا کالر خرید کر اپنی زندگی کے سب سے بڑے واقعے میں شریک ہو سکے۔

اس نحیم شحیم دیو کو اپنی ماں سے بڑا پیار تھا۔اس کا پہلا ڈرامہ سٹیج ہونے سے تین دن قبل اس کی ماں کو فالج ہو گیا۔چنانچہ پیرس میں اپنی عظیم کامیابی کی پہلی رات کے موقع پر ڈوما اپنے ڈرامے کے ہر ایکٹ کے اختتام پر بھاگم بھاگ اپنی ماں کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔اور اس رات جبکہ سارے پیرس میں اس کا نام مشہور ہو چکا تھا وہ ایک چٹائی پر اپنی ماں کے قدموں میں سویا تھا۔

ڈوما کے ناولوں کا کردار اس کے نزدیک بڑا حقیقی تھا۔ وہ ان کے خواب دیکھتا اور ان کے بارے میں اس طرح باتیں کرتا جیسے وہ بالکل حقیقت ہوں۔وہ ان کے بارے میں ایسے شوق سے لکھتا کہ آج ایک سو سال کے بعد بھی وہ آپ کو مسحور کر دیتے ہیں۔بعض اوقات کردار نگاری کرتے وقت وہ اپنی کہانی میں اس قدر محو ہو جاتا کہ بلند آواز میں قہقہے

لگاتا اور اپنے کرداروں سے اس طرح مذاق کرنے لگتا جس طرح وہ اس کے ارد گرد بیٹھے ہوں۔ بہت سارے مصنفین کے لئے لکھنے کا عمل تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر ڈوما کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسے لکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

وہ ایک مشتاق سیاح تھا۔ اس نے سارا یورپ گھوما تھا۔ اس نے ایک ہی وقت میں پانچ ناول شروع کر رکھے تھے اور یہ روزانہ قسط وار اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی کتابیں پڑھ سکے۔ لیکن اس کے پاس اتنا وقت ضرور تھا کہ وہ تلواروں اور پستولوں سے بیس ڈوئل لڑ سکے۔ جوں جوں وہ بوڑھا ہوتا گیا، شراب اور عورتوں کی طرف راغب ہونے لگا۔ نہیں نہیں میں نے غلط کہا ہے۔ اس نے نہ تو شراب پی اور نہ ہی موسیقی کی طرف مائل ہوا۔ مگر وہ لڑکیوں کا بڑا متوالا ہو گیا تھا۔

ایک دن دوپہر کو اس کا ایک دوست اسے ملنے آیا تو اسے لڑکیوں میں گھرا پایا۔ ایک اس کے گھٹنے پر بیٹھی تھی۔ دوسری لڑکی اس کے قدموں پر لیٹی ہوئی تھی۔ ایک اور لڑکی اس کے سر پر جھکی ہوئی اس کے موٹے موٹے ہونٹ چوم رہی تھی اور ان تینوں لڑکیوں کا لباس اس قدر نہ تھا کہ کسی مرد کے سامنے آ سکیں۔

لوگ اس کی دولت لوٹ کر اسے چھوڑ کر چلے جاتے۔ ڈوما نے اپنا بڑھاپا مفلسی اور تنہائی میں گزارا۔ یہاں تک نوبت آن پہنچی کہ مکان کا کرایہ ادا کرنے کے لئے اسے اپنے زیورات حتیٰ کہ اپنا اوورکوٹ بھی گروی رکھنا پڑا۔ اگر اس کا بیٹا اس کی مدد نہ کرتا تو اسے بھوکوں مرنا پڑتا۔ موت سے تھوڑی دیر قبل اس کے بیٹے نے دیکھا کہ وہ اپنا مشہور ناول ''تین بندوقچی'' پڑھ رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے اس سے پوچھا ''ابا آپ کو یہ ناول کیسا لگ رہا ہے؟'' ''اچھا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

اچھا ہے؟ میں بھی یہی کہوں گا۔ اگر آپ تفریح طبع کے خواہشمند ہیں تو یہ ناول پڑھیں۔ اس کے ناول کے بعد آج تک لاکھوں ناول لکھے گئے ہیں لیکن وہ سب اس کے سامنے ماند پڑھ گئے ہیں۔ ''تین بندوقچی'' ایک لافانی ناول ہے۔ آج سے دو سو سال کے بعد بھی آپ کے بچوں کے بچے، پھر ان کے بچے رات کی خاموشی میں بڑے مزے سے یہ ناول پڑھ رہے ہوں گے۔

او۔ او۔ مکن ٹائر

دو کروڑ لوگ اس کا اخباری کالم ہر روز پڑھتے تھے لیکن وہ مداحوں کے سامنے آنے سے بے حد گھبراتا تھا۔

کئی سال تک او۔ او۔ مکن ٹائر اپنے اخباری کالم ''روزمرہ کے نیویارک'' کے سبب بڑا مشہور رہا۔ چار سو اٹھانوے اخبار اس کالم کو شائع کرتے تھے اور تقریباً دو کروڑ لوگ اس کا یہ کالم ہر روز پڑھتے۔

وہ نیویارک کی روزمرہ زندگی کا بہترین مبصر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مسوری میں پیدا ہوا اور چوبیس سال کی عمر سے پہلے اسے نیویارک آنے کا موقع نہ ملا۔ لاکھوں لوگوں کے نزدیک مکن ٹائر کئی سال تک نیویارک کا مقبول ترین آدمی رہا۔

ایک دفعہ مجھے ٹیکساس کے شہر امیریلو میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ نیویارک کے محض دو آدمیوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ ایک او۔ او۔ مکن ٹائر اور دوسرا آرتھر، بیرس مین۔

لوگ لفافے پر مکن ٹائر کی تصویر لگا کر اس پر کسی قسم کا پتہ لکھے بنا لیٹر بکس میں ڈال دیتے اور وہ لفافہ اسے مل جایا کرتا تھا۔ اسے ہر ہفتے اس قسم کے تین چار خط ملا کرتے تھے۔

مکن ٹائر عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ مثال کے طور پر جس اخبار میں اس نے کئی سال ملازمت کی اور جہاں سے وہ چار سو تیس پونڈ فی ہفتہ تنخواہ لیتا رہا۔ اس کے مالک سے وہ اس سارے عرصے میں صرف تین دفعہ ملا۔ وہ اپنی تحریروں کے زور پر ایک سال میں بیس ہزار پونڈ کماتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے پاس کوئی سٹینوگرافر نہیں تھا۔ وہ اپنے مضمون خود ہی لکھتا تھا۔

اس کی تنخواہ امریکہ کے صدر سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی اپنے دفتر کی پرواہ نہ کی۔ حالانکہ اس کا ایک آفس بھی تھا۔ لیکن وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ اپنا سارا کام گھر پر ہی کیا کرتا تھا۔ مکن ٹائر کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی تھی کہ وہ ریڈیو پر تقریر وغیرہ کرے۔ حالانکہ اسے ایک سال کے اندر ریڈیو کے اکتیس معاہدے پیش ہوئے تھے۔

ایک دفعہ تو ریڈیو والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اس کے دفتر میں مائیکروفون لگا دیں گے اور سو پونڈ فی منٹ کے حساب سے اسے تقریر کرنے کا معاوضہ دیں گے۔ لیکن وہ نہ مانا۔

وہ فلموں میں بھی کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کئی سال تک ہالی وڈ والے اس کے پیچھے پڑے رہے۔ وارنر برادرز والے اس سے اپنی ایک فلم میں کام کروانے پر تل گئے۔ لیکن وہ ہر دفعہ انکار کرتا رہا۔ آخر کار انہوں نے اسے ایک خالی چیک بھیج دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس پر جتنی رقم چاہے بھر سکتا ہے لیکن اس نے وہ چیک بھی واپس کر دیا۔

ایک مرتبہ میں نے اس سے استفسار کیا کہ اس نے اتنے عظیم مواقع کیوں ہاتھ سے گنوا دیئے۔ تو اس نے جواب دیا ''دراصل مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بولنا نہیں آتا۔'' اس نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک دعوت کے موقع پر اس نے تقریر کرنی چاہی تو وہ اس قدر گھبرا گیا کہ اس کے حلق میں الفاظ اٹکنے لگے۔ اور وہ ایک بھی لفظ نہ کہہ سکا۔

اس کے خیال میں اگر وہ ریڈیو پر پروگرام کرنا شروع کر دے یا فلموں میں کام کرنا شروع کر دے تو ناکام ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ حکومت نے اس کی آمدنی کا اسی فیصد بطور ٹیکس وصول کر لینا تھا۔ چنانچہ وہ کیوں سر کھپاتا پھرے۔

مکن ٹائر پٹس برگ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ وہ تین سال کا تھا کہ اس کی ماں انتقال کر گئی۔ اس لئے اس کی نانی اسے اپنے ساتھ گیلی پولس لے گئی۔ بعد میں مکن ٹائر ایک ہوٹل میں کلرک کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس ہوٹل میں اکثر نیو یارک سے آنے والے مسافر ٹھہرتے تھے جو بڑے اعلیٰ لباس میں ہوتے تھے۔ مکن ٹائر ان کے لباس سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے بھی نیو یارک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ سفر کر سکتا۔ لیکن ایک چیز اس کے پاس تھی اور وہ چیز بہت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے اندر جوان جذبات کی آگ روشن

تھی۔ نیو یارک کے بارے میں اسے جس قدر کتب ملیں وہ اس نے پڑھ ڈالیں۔ پھر ''اوہیو'' میں کئی سال تک مختلف اخبارات میں کام کرنے کے بعد ''مین ہنٹرف'' آیا اور ہینسٹن نامی کے رسالے میں کام شروع کیا۔ لیکن تین ماہ کے بعد ہی وہ رسالہ بند ہو گیا۔ پھر ''ایوننگ میل'' میں پروف ریڈر کے طور پر کام کرنے لگا۔ کیونکہ یہ کام اس کے مزاج کے خلاف تھا اس لئے اس نے دل لگا کر کام نہ کیا، اور اسی لئے اسے اس ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

پھر اس نے اپنی خواہش کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا اس نے نیو یارک کے متعلق ہر روز ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن کوئی اس کے مضمون چھاپنے کو تیار نہ ہوا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ چند ایک اخبارات میں انہیں شائع کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے مضامین کی مانگ بڑھ گئی اور اس قدر بڑھ گئی کہ وہ دنیا کا مقبول اور مصروف ترین صحافی بن گیا۔

مکن ٹائر کے بارے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ حالانکہ وہ شہر کے سب سے زیادہ آبادی والے علاقے میں رہتا تھا۔ لیکن وہ ہجوم سے بے پناہ نفرت کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ ایک سال تک وہ اپنے ہوٹل سے باہر نہ آیا۔ اس کے دوست اسے لباس زیب تن کرنے کی ترغیب دیتے۔ پھر اس کے ہاتھ میں چھڑی دے کر اسے باہر لانے کی کوشش کرتے لیکن وہ ہوٹل کے بیرونی دروازے تک ان کے ساتھ آ کر واپس چلا جاتا۔

ماہرین نفسیات اس قسم کے خوف کو آدم بیزاری کا نام دیتے ہیں۔ مکن ٹائر نے مجھے بتایا کہ وہ کئی سال چھپ چھپا کر تھیٹر جاتا رہا تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ اگر لوگ اسے دیکھ کر پہچان لیتے تو وہ ہجوم میں گھبرا جاتا اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ مکن ٹائر نہ شراب پیتا تھا نہ ہی سگریٹ کو ہاتھ لگاتا۔ وہ اکثر چیونگم کھاتا رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک رولس رائس تھی لیکن وہ زیادہ تر پیدل ہی چلا کرتا تھا۔ اس نے ہر روز کم از کم تین میل پیدل چلنا اپنی عادت بنالی تھی۔

نیو یارک کا بہترین درزی اس کا لباس سیتا تھا۔ اس کے پاس اتنے اعلیٰ لباس تھے کہ پرنس آف ویلز دیکھ کر رشک کرتا۔ لیکن وہ سارا دن اپنے ڈریسنگ گاؤن اور پاجامے میں ملبوس اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ اس نے بس ایک لڑکی سے محبت کی اور اسی سے شادی کی۔ شادی کے وقت وہ چوبیس سال کا تھا۔

او ہنری

وہ پانچ برس جیل میں رہا اور نامور
ادیب بن گیا۔

آپ کے خیال میں مشہور ترین افسانہ نگار کون ہے؟ ویسے میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ نے اس کی کہانیاں ضرور پڑھ رکھی ہیں اور ان کا ترجمہ تقریباً ہر زبان میں کیا جا چکا ہے (مثلاً جاپانی، اسپرانتو، اردو، عربی، فارسی، نارویجی، ڈنمارکی، چیکوسلواکی) اس کا قلمی نام او ہنری تھا اور وہ آج سے کوئی اسی سال پہلے پیدا ہوا تھا۔

او ہنری کی زندگی ایک ایسے انسان کی زندہ مثال ہے جس نے کڑی مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور مشکل حالات کے باوجود کامیابی حاصل کی۔

اس کی راہ میں حائل سب سے پہلی رکاوٹ یہ تھی کہ اس نے بڑی کم تعلیم حاصل کر رکھی تھی، وہ کبھی ہائی سکول میں نہیں پڑھا، اور نہ کبھی کالج کی شکل دیکھی، اس کے باوجود آج امریکہ کی آدھی یونیورسٹیوں میں اس کی تحاریر اس لئے پڑھی جاتی ہیں کہ وہ اعلیٰ تحریر کے مثالی نمونے ہیں۔

دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ بیماری کی وجہ سے اس کا حال خراب ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ وہ تپ دق سے مر جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے اسے ٹیکساس بھجوا دیا۔ وہاں اس نے ایک رانچ (مویشیوں کا میلوں لمبا باڑہ) پر بھیڑوں کی دیکھ بھال کا کام شروع کیا۔

آج سیاح موٹروں میں بیٹھے سینکڑوں میل دور سے اس رانچ کو دیکھنے آتے ہیں

اور وہاں پہنچ کر موٹر روک دیتے ہیں اور اس جگہ کا ادب واحترام کے ساتھ پیدل چکر لگاتے ہیں جہاں کبھی او ہنری بھیڑیں چراتا تھا۔ تیسری بدقسمتی یہ تھی کہ اسے جیل جانا پڑا۔ اب سنیں کہ وہ کس وجہ سے جیل گیا۔

جب وہ صحت یاب ہو گیا تو اس نے ٹیکساس کے ایک شہر اوسٹن کے ایک بینک میں خزانچی کی ملازمت کی۔ اس علاقے کے گلہ بانوں اور کاؤبوائے لوگوں کی ایک عادت یہ تھی کہ جب کلرک مصروف ہوتے تو وہ بینک میں داخل ہو جاتے اور جتنا دل چاہے روپیہ جیب میں ڈال کر اس کی رسید پر دستخط کر کے چلتے بنتے۔

ایک دن اسٹیٹ بینک کا محاسب اچانک وہاں آن پہنچا۔ بینک کا حساب کرنے پر روپیہ کم پا کر او ہنری کو گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ وہ خزانچی تھا۔ اس پر مقدمہ چلا۔ اس نے کبھی ایک ڈالر کی بے ایمانی نہیں کی تھی لیکن اسے پانچ سال کی سزا ہو گئی۔

اس وقت تو یہ سزا کسی ناگہانی آفت سے کم نہ تھی۔ لیکن ایک طرح سے یہ او ہنری کی خوش قسمتی ثابت ہوئی۔ کیونکہ او ہنری نے جیل ہی میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا اور ایسے افسانے تحریر کئے کہ جن کی بدولت وہ مقبول ہوا اور اس کی عزت ہوئی۔ یہ ممکن تھا کہ اگر وہ جیل نہ جاتا تو ایک افسانہ بھی نہ لکھ پاتا۔

میں حال ہی میں سنگ سنگ جیل کے وارڈن سے ملا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس جیل کا تقریباً ہر قیدی اپنی زندگی کی کہانی لکھنے کا خواہشمند ہے۔ درحقیقت سنگ سنگ جیل میں اتنے قیدی لکھنے کے خواہشمند ہیں کہ جیل کے اسکول نے ان کے لئے افسانہ نویسی کا ایک مفت کورس شروع کر رکھا ہے۔ فطرتاً ان میں سے بہت کم کامیاب ہوتے ہیں لیکن یہ امر مسلم ہے کہ بہت سے مشہور لوگوں نے جیل ہی میں لکھا ہے۔

مثلاً مشہور بانکے سر والٹر ریلے کو لے لیں جو اپنے جوتوں میں ہیرے لگواتا اور کانوں میں موتی پہنتا تھا۔ اس نے کیچڑ پر اپنا لبادہ اس لئے بچھا دیا کہ ملکہ ایلزبتھ کے جوتے خراب نہ ہوں۔ اس نے جیل ہی میں لکھا ہے۔ سیاسی رقابت کی بنا پر وہ چودہ سال قید رہا۔

اس کی کوٹھڑی تنگ اور سیلن زدہ تھی۔ دیواروں سے گدلا پانی رستا تھا سردی کے باعث وہ بہت تکلیف میں رہا، اس کا بایاں بازو گنٹھیا کی وجہ سے اکڑ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ

بھی برے حال میں تھے۔اپنی دل شکستگی اور بدحالی کے باوجود اس نے قید خانے میں ایک تاریخ رقم کی۔یہ واقعہ گزرے تین سو سال ہو چکے ہیں لیکن یہ تاریخ کالجوں اور سکولوں میں اب بھی پڑھائی جاتی ہے۔

انگریزی مصنف جون بنین بارہ سال قید رہا تھا۔اسے یہ سزا اپنی مذہبی تعلیمات کی وجہ سے ملی تھی۔جیل میں وہ اپنے بھوکے بچوں اور بیوی کا پیٹ پالنے کے لئے لیس بنایا کرتا تھا۔اس کے ہاتھ لیس بنایا کرتے تھے اور اس کا ذہن عظیم خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا تھا،اس نے اپنی سرد، تاریک اور سیلن زدہ کوٹھری میں ایک کتاب لکھی جسے امریکہ کے ہر طالب علم نے پڑھا ہے۔اس کتاب کا نام ”پلگرمز پراگریس“ ہے۔اور اس کا ترجمہ اتنی زبانوں میں کیا جا چکا ہے کہ اس ضمن میں قرآن مجید اور انجیل کے علاوہ اور کسی کتاب کو اس پر برتری حاصل نہیں۔

ہسپانوی مصنف سیروانتیس نے اپنا مشہور ناول ”وون کیخوتے“ جیل ہی میں لکھا تھا۔والٹر اور اسکر وائلڈ کو بھی یہ عزت نصیب ہوئی۔ہٹلر کی خودنوشت کی دس لاکھ سے زائد نقول فروخت ہوئی تھیں اور اس کتاب کا کچھ حصہ ہٹلر نے قید کے دوران لکھا تھا۔سچ پوچھیں تو میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر آپ لکھنے کے خواہشمند ہیں تو کہیں چوری کیجئے اور گرفتار ہو جائیں (خیال رہے کہ ہندوستان میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے بھی جیل میں رہ کر بہت کچھ لکھا ہے)

آج سے ڈھائی سو سال پہلے جب انگریزی شاعر رچرڈ لوئیس کو جیل بھیجا گیا تو اس نے انگریزی زبان کی ایک بڑی مقبول نظم لکھی۔یہ ایک عشقیہ نظم ہے جو اس نے اپنی محبوبہ کے لئے لکھی تھی۔اس کا نام ”جیل خانے سے ایلتھیا کے نام“ ہے۔

پتھریلی دیواروں سے قید خانے نہیں بنتے، نہ لوہے کی سلاخوں سے قفس، بے داغ اور بے گناہ ذہن کے لئے تو عزت کی کنجی ہے۔اگر مجھے محبت کرنے کی آزادی حاصل ہے اور میری روح آزاد ہے تو یہ ایسی آزادی ہے جو صرف عالم بالا کے فرشتوں کو حاصل ہوئی۔

ایچ۔جی۔ویلز

اگر بچپن میں اس کی ٹانگ نہ ٹوٹتی تو وہ ساری زندگی عدد کار پر کلرک کی حیثیت سے گزار دیتا۔

تقریباً نوے سال پہلے کا ذکر ہے کہ لندن کی مضافاتی گلیوں میں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے کہ ایک حادثہ پیش آیا،ایک بڑے لڑکے نے چھوٹے لڑکے کو جس کا نام برٹی ویلز تھا اٹھا کر اوپر ہوا میں پھینکا۔جب وہ لڑکا نیچے آیا تو بڑے لڑکے نے اسے کیچ کرنا چاہا مگر وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔

کئی ماہ تک برٹی ایک عذاب مسلسل میں اپنے بستر پر پڑا رہا۔اس کی ٹانگ کے ساتھ وزن باندھ دیا گیا۔چند مہینوں کے بعد جب ٹانگ کا معائنہ ہوا تو معلوم ہوا کہ ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی اپنی درست جگہ پر نہ تھی۔اس لئے ہڈی کو دوبارہ جوڑا گیا۔ننھا برٹی کئی روز اس تکلیف سے نڈھال رہا۔

برٹی کے لئے اس وقت یہ تکلیف ایک المیے سے کم نہ تھی۔لیکن اس المیے کی وجہ سے اس کا شمار دنیا کے مقبول مصنفین میں ہونے لگا۔اب آپ اسے برٹی کے نام سے نہیں بلکہ ”ہربرٹ جارج ویلز“ یا ”ایچ، جی، ویلز“ کے نام سے جانتے ہیں۔ممکن ہے کہ آپ نے اس کی بعض کتابیں پڑھی بھی ہوں۔اس نے پچھتر سے زائد کتب لکھیں۔یہ بات اس نے خود مانی ہے کہ اس کی ٹانگ کا ٹوٹنا شاید اس کی زندگی کا سب سے اچھا حادثہ تھا۔ایسا

کیوں؟ کیونکہ ٹانگ ٹوٹنے کی وجہ سے وہ ایک سال تک گھر سے باہر نہ نکلا تھا۔ بستر پر پڑے رہنے سے شروع میں تو وہ تنگ آ گیا لیکن پھر اس نے کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اسے جو کتاب بھی ملی اس نے پڑھ ڈالی۔ کیونکہ اس کے علاوہ اسے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے مطالعے کا شوق ہو گیا۔ اسے ادب سے محبت ہو گئی۔ اس نے عزم مصمم کر لیا کہ وہ زندگی میں نام پیدا کرے گا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ اس کی زندگی میں کایا پلٹ ثابت ہوئی۔

ایچ، جی، ویلز ان مصنفین میں شمار ہوتا ہے جو اپنی تخلیقات کا سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرتے تھے۔ اس نے اپنے قلم سے تقریباً دو لاکھ پونڈ کمائے تھے۔ لیکن اس کا بچپن بڑی مفلسی میں گزرا تھا۔ اس کا باپ کرکٹ کا پیشہ ور کھلاڑی تھا اور ساتھ ہی کراکری کی ایک دکان بھی چلاتا تھا۔ لیکن یہ دوکان بالکل نہ چلتی تھی۔ ایچ، جی، ویلز اس دکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا کچن دکان کے نیچے ایک تہہ خانے میں تھا۔ وہ تہہ خانہ تاریک اور سیلن زدہ تھا۔ اس کے اندر روشنی آنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ باہر فٹ پاتھ پر ایک روشندان اس تہہ خانے میں کھلتا تھا۔ ایچ، جی، ویلز کی ابتدائی یاداشتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اس تاریک کچن میں بیٹھا اس روشندان کے قریب سے گزرنے والوں کے پیر دیکھتا رہتا۔ کئی سالوں کے بعد اس نے ان پیروں کے بارے میں لکھا اور بتایا کہ وہ کیسے لوگوں کے بوٹ دیکھ کر ان کے بارے میں اندازے لگایا کرتا تھا۔

آخر کار کراکری کی دکان ناکام ہو گئی۔ گھریلو حالات دن بدن خراب ہونے لگے تو فاقوں سے بچنے کے لئے اس کی ماں نے سوسکس میں ایک امیر خاندان میں ملازمت کر لی۔ ایچ، جی، ویلز اکثر اپنی ماں سے ملنے وہاں جایا کرتا تھا۔ وہاں اس نے پہلی بار اونچے طبقے کی طرز معاشرت دیکھی۔

ایچ، جی، ویلز تیرہ سال کی عمر ہی میں اپنی روزی خود کمانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے ایک درزی کی دکان پر ملازمت کی۔ اسے صبح پانچ بجے اٹھ کر دکان صاف کرنا پڑتی۔ پھر وہ آگ جلا کر چودہ گھنٹے دکان پر کام کیا کرتا۔ یہ کام اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ایک ماہ کے بعد ہی دکان کے مالک نے اسے تھپڑ مار کر ملازمت سے فارغ کر دیا کیونکہ اس کے کپڑے بڑے گندے ہوتے تھے۔

پھر اس نے ایک کیمسٹ کی دکان پر ملازمت کی۔ لیکن وہاں سے بھی اسے جواب دے دیا گیا۔

آخر کار اسے ایک دوسرے درزی کے ہاں ملازمت ملی۔ چونکہ پیٹ پالنے کی خاطر اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس لئے اس نے اس دکان پر دل لگا کر کام کیا۔ لیکن جب بھی اسے موقع ملتا تو وہ چھپ چھپا کر ہربرٹ سپنسر کی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔

اس نے دو سال وہاں ملازمت کی۔ مگر یہ ملازمتیں اس کی برداشت سے باہر تھیں۔ آخر کار ایک اتوار کی صبح کو وہ اٹھا اور بنا کچھ کھائے پئے خالی پیٹ پندرہ میل پیدل سفر کرتا ہوا اپنی ماں کے پاس جا پہنچا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ ماں کو دیکھ کر وہ زاروقطار رونے لگا۔ اس نے ماں سے قسم کھا کر کہا کہ وہ ایسی ملازمتیں کرنے کی بجائے خود کو مار ڈالے گا۔

پھر اس نے ایک درد بھرا خط اپنے ایک پرانے اسکول ماسٹر کو لکھا۔ ویلز نے اسے اپنے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اس خط کا جواب آئے گا۔ لیکن چند روز بعد جب جواب آیا تو وہ بڑا حیران ہوا۔ اس کے استاد نے اسے اپنے سکول میں ملازمت کی پیش کش کی تھی۔

یہ اس کی زندگی کی کایا پلٹنے کا دوسرا واقعہ تھا۔

سکول کی ملازمت کرتے ہوئے ابھی اسے چند ہی سال گزرے تھے کہ ایک ناگہانی آفت نے اسے آ لیا۔ ہوا یوں کہ وہ فٹ بال کھیل رہا تھا۔ کھیلتے ہوئے اسے چوٹ لگی اور وہ گر پڑا۔ اس کی نبض چھوٹ گئی اور وہ موت کے قریب ہو گیا اس کا ایک گردہ پھٹ گیا اور اس کے داہنے پھیپھڑے میں سوراخ ہو گیا۔ اس کے اندر سے خون بے طرح بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ کئی ماہ زندگی اور موت کی کشمکش میں رہا۔ اس کے بارہ سال بعد تک اس نے نیم اپاہجوں کی سی زندگی گزاری۔ لیکن اس کے بعد اس نے وہ کتب لکھنے کا آغاز کیا جن کی وجہ سے وہ مہذب دنیا میں مقبول ہوا۔

پانچ سال تک اس نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن اس نے اپنی کتب جس بھی ناشر کے پاس بھیجیں اس نے انہیں شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک ناشر نے اسے یوں مشورہ دیا

کہ وہ انہیں جلا دے اور دوبارہ سے لکھنا شروع کر دے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کو اس کا مشورہ معقول نظر آیا اور اس نے اپنی پانچ سال کی محنت آگ میں جھونک دی۔

آخر کار نیم اپاہج ہونے کے باوجود اسے ایک اور سکول میں نوکری مل گئی۔ وہاں بیالوجی کی کلاس میں اسے ایک خوبصورت لڑکی ملی۔ اس کا نام کیتھرین روبرز تھا۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کو لگا کہ وہ بائیو کی نسبت کیتھرین میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ کیتھرین تھی تو خوبصورت لیکن اس کی صحت اچھی نہیں تھی اور وہ اکثر بیمار رہا کرتی تھی۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کا بھی یہی حال تھا۔ چنانچہ انہوں نے آپس میں شادی کر ڈالی۔

یہ واقعہ ساٹھ سال قبل کا ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز مرنے کی بجائے دن بدن صحت مند ہوتا گیا۔ انجام کار وہ انسانی طاقت کا ایک زبردست ذخیرہ ثابت ہوا۔ ہر سال وہ ضخیم کتب لکھتا۔ ایسی کتب جو دنیا کو ہلا ڈالتیں۔

ویلز کے ذہن میں روشن خیالات چکراتے رہتے تھے۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ایک نوٹ بک میں اپنے خیالات درج کرتا رہتا۔ یہ سست لڑکا جس کو ایک درزی نے اس کے گندے لباس کی وجہ سے تھپڑ مار کر اپنی دکان سے نکال دیا تھا۔ اسی لڑکے کی نوٹ بک میں اتنے خیالات اکٹھے تھے کہ اگر وہ ڈیڑھ سو سال بھی لکھتا رہتا تو ختم نہ ہوتے۔

ایچ۔ جی۔ ویلز جہاں بھی چاہتا، کچھ لکھ سکتا تھا۔ لندن میں اپنی ورکشاپ میں گاڑی میں سفر کرتے ہوئے یا بحیرہ روم کے ساحل پر کسی چھتری تلے بیٹھے۔ فرنچ ریویرا کے کنارے پر ایک دکان کرائے پر لی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک اس کی ورکشاپ تھی اور دوسرا مہمان خانہ تھا۔ سارا دن کام کرنے کے بعد شام کا وقت وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ گپ لگاتے ہوئے گزارتا۔ اگر کسی وجہ سے وہ اپنے مہمانوں کا استقبال کرنے سٹیشن پر نہ جا سکتا تو وہ ایک اور بہترین کام کرتا۔ وہ اپنی بہترین گاڑی ان کے لئے بھیج دیتا اور ساتھ ہی اپنے مہمان خانے کی چابیاں بھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب وہ اپنے مہمانوں سے ملتا تو وہ اچھے موڈ میں ہوتے۔

ایڈگر ایلن پو

چھبیس برس کی عمر میں وہ اپنی بیوی سے دگنی عمر کا تھا۔ اسے اپنی دس برس کی محنت کا معاوضہ فقط دو پونڈ ملا۔

ایڈگر ایلن پو پراسرار کہانیاں لکھنے اور اپنی شاعری کی وجہ سے انگریزی ادب میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اسے امریکی ادب کا دیو کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ورجینیا یونیورسٹی سے اس وجہ سے نکال دیا گیا کہ وہ شراب اور جوئے کی لت میں بری طرح گرفتار ہو گیا تھا۔ بعد میں ویسٹ پوائنٹ ملٹری اکیڈمی میں بار بار اس کا کورٹ مارشل ہوتا اور انجام کار وہ وہاں سے اس وجہ سے نکالا گیا کہ وہ ملٹری کے سارے قواعد وضوابط کو نظر انداز کر کے اپنے کوارٹر میں بیٹھا شعر لکھتا رہتا تھا اور کبھی پریڈ میں حاضر نہ ہوتا۔

پو اپنی زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ ایک امیر تاجر نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا۔ آخر کار وہ تاجر بھی اس کی عجیب حرکات کی وجہ سے اس سے متنفر ہو گیا اور اس نے پو کو مار پیٹ کر گھر سے نکال باہر کیا۔ اسے اپنی جائداد سے بے دخل کر دیا اور اپنے وصیت نامے میں لکھ دیا کہ اسے اس کے سرمائے سے ایک دھیلا بھی نہ دیا جائے۔

پو کی شادی کی کہانی ایک خوبصورت ادبی کہانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اپنی چچا زاد بہن ورجینیا کلم سے شادی کر لی۔ شادی کے وقت وہ مفلس تھا۔ اس کے پاس کبھی پیسے نہ ہوتے تھے اور نہ اسے آئندہ ملنے کی امید تھی۔ وہ بے تحاشا کچی شراب پیتا۔ اس

کی اکلوتی بہن پاگل ہو چکی تھی اور اکثر لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ بھی نیم پاگل تھا۔ وہ اپنی بیوی سے دگنی عمر کا تھا۔ اس کی بیوی تیرہ سال کی تھی جبکہ وہ خود چھبیس سال کا تھا۔ تمام پیش گوئیوں کی رو سے اس کی شادی کو جلد ہی منقطع ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہ ہوا اور اس کی شادی کامیاب ثابت ہوئی۔ پو اپنی ''بچہ بیوی'' کی پرستش کرتا تھا اور اس کی لافانی محبت میں اس نے کچھ ایسی نظمیں لکھ ڈالیں جو انگریزی ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور جو انگریزی ادب میں ایک نئے اضافے کا موجب بنیں۔

ایڈگر ایلن پو نے ایسی کہانیاں اور نظمیں لکھیں جو ادبی خزانے کی حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کے باوجود ان لافانی شاہکاروں کے عوض اسے اتنا بھی نہ ملتا کہ وہ دو وقت کا کھانا خرید سکے۔ مثلاً اس نے درج ذیل بے مثال نظم لکھی۔

میرے مکان کے دروازے کے پاس
پالاس کے پژمردہ گنبد پر
کوا ابھی تک بیٹھا ہوا ہے
وہ اڑنے کا نام نہیں لیتا
اس کی آنکھیں نیند سے چور کسی عفریت سے مشابہت رکھتی ہیں
اس کے سر پر لیمپ کی روشنی
فرش پر اس کے سائے کو خوفناک بنا رہی ہے۔

پو اپنی نظموں کے پہلے مجموعے ''زاغ'' پر دس سال محنت کرتا رہا۔ اس نے اس مجموعے کی نظموں پر کئی بار نظر ثانی کی۔ اس کے باوجود بوجہ مجبوری اس نے یہ مجموعہ صرف دو پونڈ میں فروخت کیا۔ ہالی وڈ کا نامور اداکار جون بیری اپنی ایک منٹ کی خدمات کا معاوضہ اس سے زائد لیتا ہے۔

پو کو ''زاغ'' کے بس دو پونڈ ہی ملے۔ لیکن حال ہی میں اس کا یہ اصلی مسودہ ایک لاکھ پونڈ میں فروخت کیا گیا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ عظیم شخصیات اپنی زندگی میں تو بھوکوں مرتی ہیں لیکن مرنے کے بعد ان کے شاہکار لوگ گراں قیمت پر خرید لیتے ہیں۔

نیویارک میں گرینڈ کنکورس میں وہ مکان ابھی تک موجود ہے جہاں پو اور اس کی

بیوی ورجینیا رہائش پذیر تھے۔ سو سال پہلے جب پو نے وہ مکان کرائے پر لیا تھا تو اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ اور وہ گرنے کے قریب تھا۔ لیکن اب یہ بلند قامت خوبصورت عمارات میں گھرا ہوا ہے۔ مگر اس دور میں اس کے سامنے ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا اور سیب کے درختوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اور جب جنوب سے بہار کا موسم آتا اور فضا پھولوں کی خوشبو سے معطر ہو جاتی اور ہر طرف شہد کی مکھیاں بھنبھناتیں تو یہ جزیرہ خوابوں کا جزیرہ لگتا۔

پو نے یہ مکان دس شلنگ ماہوار کرائے پر لیا تھا۔ لیکن اس میں اتنا کرایہ ادا کرنے کی بھی سکت نہ تھی۔ اکثر تو وہ مکان کا کئی ماہ کا کرایہ ہی ادا نہ کرتا تھا۔ اس کی بیوی بیمار تھی۔ وہ تپ دق کا شکار ہو گئی تھی۔ بیوی کا علاج تو ایک طرف رہا۔ اس کی پرہیزی غذا کے لئے بھی پو کے پاس رقم نہیں تھی۔ بعض اوقات تو انہیں کئی دن بنا کچھ کھائے پیئے گزارنے پڑتے۔ جب ان کے باغیچے پر کچنار کے پھول آتے تو وہ انہیں ابال کر کئی دن اپنا گزارا کرتے تھے۔

جب ہمسایوں کو معلوم پڑا کہ پو اور اس کی بیوی بھوک سے مر رہے ہیں تو وہ ان کے لئے کھانا لائے۔ کتنی قابل رحم بات ہے۔ ان سب تلخیوں کے باوجود پو کے پاس گیت لکھنے اور ورجینیا کے پاس محبت کرنے کی اہلیت تھی، اس لئے وہ اپنی مفلسی کے باوجود بھی خوش تھے۔

ورجینیا اسی مکان میں فوت ہوئی۔ اپنی موت سے کئی ماہ پہلے بیماری کی حالت میں وہ ٹاٹ پر پڑی رہتی۔ اس کے بدن پر اتنے کپڑے بھی نہ ہوتے تھے کہ اسے گرم رکھ سکتے۔ جب زیادہ سردی ہو جاتی تو اس کی ماں اس کے ہاتھ اور پو اس کے پاؤں ملتا۔ پو اپنے پرانے فوجی کمبل سے اس کا کانپتا جسم ڈھانپتا۔ رات کے وقت وہ بلی کو اس کے پاؤں میں سونے پر مجبور کرتا۔

جب وہ فوت ہوئی تو پو کے پاس اس کی تجہیز و تکفین کے لئے بھی پیسے نہیں تھے۔ آخر ہمسایوں نے مل ملا کر یہ رسوم ادا کرنے میں اس کی مدد کی۔

کئی سال قبل نیویارک کی حکومت نے وہ مکان خرید کر اسے ایک زیارت گاہ بنا دیا ہے۔ میرے لئے یہ مغموم یادوں سے معمور ایک شبستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی

میں یہاں آتا ہوں تو میرا واپس جانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ورجینیا کا انتقال جنوری میں ہوا تھا۔ وقت گزرتا گیا، موسم بہار آ کر گزرتا گیا۔ چاند سیب کے درختوں سے جھانکتا رہا اور مغربی افق میں ستارے جھلملاتے رہے۔ مگر پو اپنی بیوی کی محبت میں جلتا رہا۔ اس تپش میں اس نے ایک ایسی نظم لکھی جو محبت کا ایک لازوال تحفہ ہے۔

چاند جب بھی آیا
اپنے ساتھ اینابل لی کے حسین سپنے لایا
ستاروں کی چمک سے
مجھے اینابل کی خوبصورت آنکھوں کی چمک یاد آئی
میں ساری رات اندھیرے کی چادر میں ملفوف
سمندر کے کنارے
اپنی زندگی، اپنی پیاری بیوی کی قبر میں
اس کے پہلو میں سویا رہتا ہوں۔

چارلس ایل ڈاگ سن

وہ دنیا کی ایک مشہور ترین کتاب لکھنے پر بے حد نادم تھا۔

نوے سال قبل کا ذکر ہے کہ ایک شرمیلا نوجوان تین چھوٹی بچیوں کے ساتھ لندن میں دریائے ٹیمز میں کشتی پر سیر کرنے گیا۔ جب وہ کشتی میں سوار ہوا تو وہ ایک گمنام آدمی تھا۔ لیکن گھنٹوں بعد جب وہ بچیوں کے ساتھ کشتی میں سے نکلا تو وہ انیسویں صدی کی ایک نامور ہستی بننے کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

اس کا نام ڈاگ سن تھا۔ لیکن آپ اسے اس کے نام سے نہیں جانتے، ویسے یہ اس کا حقیقی نام تھا۔ کہیں وہ پادری ڈاگ سن کہلاتا تھا اور کہیں اسے ڈاگ سن کہا جاتا۔ درحقیقت وہ ہفتہ بھر آکسفورڈ یونیورسٹی میں ریاضی پڑھاتا تھا اور اتوار کو کلیسا میں وعظ کرتا تھا۔

بالغ لوگوں سے بات کرتے ہوئے وہ گھبرا جاتا تھا اور اس کی زبان لکنت زدہ ہو جاتی تھی۔ لیکن جب وہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو بے تکی کہانیاں سناتا تو اسے بڑا لطف آتا تھا۔ جب وہ تین بچیوں کو دریائے ٹیمز کی سیر کرا رہا تھا تو اس نے ان کا لطف دوبالا کرنے کے لئے ایک عجیب وغریب کہانی سنائی۔

اس نے ان کو ایک ایسی چھوٹی بچی کی کہانی سنائی جو نیند میں ایک خرگوش کے بل میں جا پڑی اور وہاں سے ایک حیرتناک دنیا میں جا پہنچی۔ بچیاں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی کہانی سنتی رہیں۔ وہ کشتی اور دریا کی سیر کو بالکل بھول چکی تھیں۔ کہانی کے اختتام پر انہوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان کے لئے یہ کہانی لکھے۔ پروفیسر نے ان کی بات مان لی اور ساری رات بیٹھا کہانی لکھتا رہا۔ کیونکہ ان بچیوں میں سے ایک کا نام

ایلس تھا۔اس لئے اس نے اس کہانی کا نام ''ایلس حیرتناک دنیا میں'' رکھا۔

اس نے کہانی لکھی اور ایک الماری کے گوشے میں رکھ کر اسے بھول گیا۔اس نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ کوئی اس کہانی کو پڑھنے کی خواہش کرے گا۔

کئی سال بعد اس کا ایک دوست اسے ملنے آیا اور اچانک اس کی نظر الماری میں پڑے اس مسودے پر پڑی تو وہ اس سے گرد جھاڑ کر اسے پڑھنے لگا۔کہانی پڑھ کر اسے بڑا لطف آیا اور اس نے اس کہانی کو شائع کرنے پر اصرار کیا۔لیکن پروفیسر اس پر راضی نہ ہوا۔وہ آکسفورڈ میں ریاضی کا استاد تھا۔کیا وہ دنیا پر یہ منکشف کرے کہ وہ بچوں کے لئے بے تکی اور پر مزاح کہانیاں بھی لکھتا ہے،ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔یہ اس کے شایان شان نہیں تھا۔اس نے تو اسے شائع کرانے کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔

لیکن جب ''ایلس حیرتناک دنیا میں'' شائع ہوئی تو اس پر ایک فرضی مصنف ''لیوس کیرول'' کا نام تھا۔

یہ کتاب بڑی کامیاب اور مقبول ہوئی۔

لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ خریدا اور بہت کم عرصے میں اس کا ترجمہ چودہ زبانوں میں کیا گیا۔اس کتاب کی ایک نظم کے یہ مصرعے لوگ ہر جگہ دہراتے نظر آتے۔

وارلس نے کہا:
اب کئی قسم کی باتیں کرنے کا
وقت آچکا ہے
مثلاً جوتوں، جہازوں، موسم، گوبھی اور بادشاہوں
کے بارے میں باتیں کرنے کا وقت
اور یہ سمندر ایک مدت سے کیوں جوش دکھا رہا ہے
کیا سوروں کے بھی پر ہوتے ہیں

سال بہ سال ''ایلس حیرتناک دنیا میں'' کی مقبولیت بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اب تک اس کتاب کے انگریزی میں دو سو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔پچھلے نوے سال سے یہ ساری دنیا میں بچوں کی مقبول ترین کتاب سمجھی جا رہی ہے۔

زین گرے

جب ناشر نے اس کے ناول کا مسودہ رد کر دیا
تو وہ اس کی دوکان کے باہر زار و قطار رونے
لگا۔

زین گرے امریکی ناول نگار مسلسل ناکامیوں، حوصلہ شکنی اور مفلسی کا مقابلہ کرتا رہا اور آج وہ اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ آج امریکہ تو کیا سارے یورپ میں اور دوسرے بہت سارے ممالک میں اس کے ناول شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔یہ تمام شہرت اس نے دنیا سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہ کر حاصل کی۔

آج کل رسالوں کے ایڈیٹرز زین گرے کی ایک کہانی کا معاوضہ اسے پندرہ ہزار پونڈ دیتے ہیں۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کہانی لکھنے کا وعدہ کر کے رقم لے لیتا ہے اور کہانی کے دائمی حقوق اس کے نام محفوظ رہتے ہیں اس کے باوجود کہ اس کی پہلی کتاب صرف تین پونڈ میں فروخت ہوئی تھی۔اس کے ناشرین کا کہنا ہے کہ وہ زین گرے کی کتابوں کی دس لاکھ نقول ہر سال فروخت کرتے ہیں۔مگر جب اس نے لکھنا شروع کیا تھا تو وہ مسلسل فاقوں کا شکار رہتا تھا۔

شروع شروع میں اس کا باپ اسے دندان سازی سکھانے پر مصر تھا۔زین گرے یہ کام بالکل بھی نہیں سیکھنا چاہتا تھا۔کیونکہ اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔لیکن باپ کا حکم اٹل تھا۔آخر مجبوراً اس نے دندان سازی سیکھنی شروع کی اور اس پیشے میں سند حاصل کر کے

اپنی دکان بھی کھول لی۔ وہ سارا دن لوگوں کے دانتوں کا معائنہ کرنے، پرانے دانت اکھاڑنے اور نئے دانت لگانے میں مشغول رہتا۔لیکن وہ صرف پیٹ کی خاطر مجبوراً یہ کام کر رہا تھا۔اس کے دل میں تو کوئی اور عزم تھا۔

جب وہ دانت وغیرہ بنانے میں مصروف ہوتا تو اس کا ذہن امریکہ کے مغربی علاقوں کی مار دھاڑ والی زندگی کے تصور میں کھویا رہتا۔ اسے مغرب کے وہ گھڑ سوار جو بہترین نشانہ باز ہوتے ہیں اور ذرا سی بات پر ایک خون بہا دیتے ہیں، بڑے پسند تھے۔ وہ ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھنا چاہتا تھا۔ جب کبھی اس کی دوکان کے سامنے کوئی ایسا گھڑ سوار گزرتا تو اس کے ذہن میں پہلا یہ خیال آتا کہ وہ کسی بینک کو لوٹنے جا رہا ہے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، زین گرے دوکان کی پر جمود زندگی کے تسلسل سے اکتاتا گیا۔ اس کے لئے ایک ہی جیسے دن گزارنے بے حد مشکل ہو رہے وہ سوچتا کہ لوگ کس طرح ایک ہی کام ساری زندگی کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ صبح دوکان کھولتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اسے باندھ کر وہاں لاتا ہے۔ دن کے وقت جب وہ اپنے خوابوں میں محو ہو جاتا تو اس کے لئے فقط وہی خوشی کے لمحات ہوتے تھے۔

آخر کار اس نے ادیب بننے کا تہیہ کر کے دوکان چھوڑ دی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چھوٹے سے گاؤں میں چلا گیا تا کہ کم میں گزر اوقات کر سکے۔

بعض اوقات وہ کئی مہینے بلکہ پورا برس ایک ناول لکھنے پر صرف کر دیتا۔ ناول مکمل کرنے کے بعد وہ اسے دوبارہ پڑھتا اور کئی جگہ سے اس کا پلاٹ اور کئی کردار بدل دیتا۔ پھر وہ نئے سرے سے ناول کو بڑے جوش و خروش سے پڑھتا اور دل میں خوش ہوتا کہ اس نے بڑا معرکہ سر کیا ہے۔ اسے یقین ہونے لگتا کہ وہ ایک عظیم ناول نگار بننے والا ہے۔ لیکن دوسرے لوگ تو اس کے یقین میں شریک نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ سارے امریکہ میں کوئی ایسا ناشر نہ تھا جو اس کی کتابیں شائع کرنے پر تیار ہوتا۔

وہ پورے پانچ برس تک دن رات ناول لکھتا رہا۔ ان پانچ سالوں میں اس کی آمدنی صفر کے برابر تھی۔ وہ کبھی کبھار گرمیوں میں بیس بال کے پیشہ ور کھلاڑی کی حیثیت

سے تھوڑا بہت روپیہ کما لیتا۔ لیکن اپنی نگارشات سے اسے اب تک ایک پائی نہ وصول ہوئی تھی۔

ایک دن جب وہ ایک ناول فروخت کرنے کی غرض سے ایک ناشر کے پاس گیا ہوا تھا تو اس کی ملاقات کرنل بفیلو جونز سے ہو گئی۔ کرنل جونز ایک ایسے ادیب کی تلاش میں تھا جو اس کے ساتھ مغربی علاقوں میں جائے اور اس سفر روئیداد دلکش پیرایہ میں لکھے۔ زین گرے مغربی علاقوں کی زندگی کا پہلے ہی سے گرویدہ تھا اور اسے دیکھے بغیر اسی کے متعلق لکھتا رہتا تھا۔ یہ موقع اس نے ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کرنل جونز کے ساتھ جانے کے لئے ایک دم رضامند ہو گیا۔

چھ ماہ مغرب کی ہنگامہ خیز اور پر خطر دنیا میں گزارنے کے بعد زین گرے گھر واپس آ گیا اور اگلے چھ ماہ اسی دنیا کے متعلق ایک ناول لکھنے میں مصروف رہا۔ اس مرتبہ اسے یقین تھا کہ اس کا ناول ضرور فروخت ہو جائے گا۔ آخر ناول مکمل کرنے کے بعد اس نے اسے ایک ناشر کے پاس بذریعہ ڈاک ارسال کر دیا اور دو ہفتوں تک بڑی بے صبری سے جواب کا منتظر رہا۔ مزید انتظار کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ خود ہی اس ناشر کے پاس پہنچ گیا۔

ناشر نے اس کا مسودہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا،

"مجھے افسوس ہے کہ میں یہ کتاب شائع نہیں کر سکتا۔ دراصل اس میں کچھ ہے ہی نہیں۔ یہ کتاب دیکھنے کے بعد میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کبھی اچھے مصنف نہیں بن سکتے۔"

زین گرے پر احساس کمتری نے ایک دم بری طرح غلبہ پا لیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ اس کا پانچواں ناول تھا جسے رد کر دیا گیا تھا۔ اگر کوئی اچانک اس کے سر پر اس وقت بھاری پتھر بھی مار دیتا تو اسے بالکل احساس نہ ہوتا۔ وہ خستہ حالت میں دوکان سے باہر نکلا اور گرتا پڑتا سامنے ایک لیمپ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ ناول کا مسودہ اس کے ہاتھ میں تھا، پوسٹ لیمپ کا سہارا لئے وہیں کھڑا وہ بے اختیار رونے لگا۔ اس کے ضبط کی طنابیں اس بری طرح ٹوٹیں کہ وہ کتنی دیر وہاں کھڑا منہ

چھپائے روتا رہا۔

وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں واپس گھر چلا آیا۔اس کی بیوی کے پاس کچھ پونجی تھی۔اب تک وہ اسی کے سہارے دن گزار رہے تھے۔اب ان کے ہاں ایک بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔میاں بیوی سخت تذبذب کے عالم میں تھے۔آخر اس کی بیوی نے اس کی ہمت بندھائی اور اسے ایک اور ناول لکھنے کی ترغیب دی۔وہ سردیوں کا وقت تھا۔سٹوو اس قدر بڑا نہ تھا کہ سارے کمرے کو گرم رکھ سکتا۔لکھتے لکھتے اس کی انگلیاں یخ بستہ ہو جاتیں۔وہ سٹوو کو کھولتا اور اس میں ہاتھ ڈال کر انگلیاں گرم کر کے دوبارہ لکھنا شروع کر دیتا۔

وہ سارا موسم زمستان اور گرمیوں کا ایک حصہ وہ اس ناول پر محنت کرتا رہا۔جب وہ ناول مکمل ہو گیا۔تو وہ اسے ہارپر پبلشنگ ہاؤس والوں کے پاس لے گیا۔جنہوں نے اس کے پہلے ناولوں کی طرح اسے بھی شائع کرنے سے انکار کر دیا۔زین گرے نے دکھ کے عالم میں ادارے کے ادبی مشیر سے درخواست کی کہ وہ مسودے کو گھر لے جا کر غور سے مطالعہ کرے دو دن بعد جب زین گرے اس ادبی مشیر کو ملنے آیا تو وہ زین گرے کو دیکھتے ہی مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

”میری بیوی اسے ساری رات پڑھتی رہی ہے اس کے خیال میں یہ ایک عظیم ناول ہے۔ہم نے اسے شائع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“

اس ناول کا نام ”صحرا کا ورثہ“ تھا۔جب ناول چھپ کر بازار میں آیا تو لوگوں میں بے حد مقبول ہوا۔

آخر کار ایک مدت تک مفلسی اور ناکامیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد زین گرے شہرت اور دولت کے راستے پر چل نکلا۔آج اس کا شمار امریکہ کے مشہور ترین اور سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے ادیبوں میں ہوتا ہے۔اب تک اس کی ساٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان کتابوں کی آج تک دو کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔

لاؤسامے الکاٹ

محلے کے بزرگوں کو یقین تھا کہ وہ آوارہ نکلے گی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پانچ سو سال قبل یونانی ڈرامہ نویس اسکیلس نے اپنے لافانی ڈرامے ایتھنز میں پیش کئے تھے۔لیکن اسکیلس کے دور سے لے کر ”ابی آئرش روز“ نامی ڈرامے کی عظیم کامیابی تک کوئی دوسرا ڈرامہ یا فلم اپنی دلکشی کے باعث ”ننھی بیبیاں“ نامی فلم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تین ہفتوں تک نیویارک میں اس فلم پر شائقین کا اتنا ہجوم رہا کہ دیکھنے اور سننے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔اس فلم کے سترہویں دن سیٹوں کا اس قدر مطالبہ تھا کہ میلوں دور تک لوگوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔دکاندار اور راہ گیر حیرت زدہ تھے۔ایسا نظارہ نیویارک کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

یہ جذباتی شہ پارہ کس طرح لکھا گیا تھا۔یہ داستان بذات خود ایک کہانی ہے۔

اس کہانی کی مصنفہ کا نام لاؤسا ایم الکاٹ ہے۔وہ جوانی کے دنوں میں ایک ٹام بوائے تھی اور سارا دن یونہی گلیوں میں سیٹیاں بجایا کرتی تھی۔وہ بڑی ہوئی تو بھی اسے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں لکھنے سے پرہیز کیا کرتی تھی۔اس کی طبیعت کا رجحان اس طرف نہیں تھا۔لیکن اس کے ناشر کا اصرار تھا کہ وہ لڑکیوں کے بارے میں کہانی لکھے۔بظاہر تو وہ اس کی بات سے متفق تھی لیکن درحقیقت وہ

اس سے بڑی ناراض تھی۔

درحقیقت جب تک کوئی مصنف لکھنے میں خوشی محسوس نہ کرے اس وقت تک پڑھنے والا بھی اس سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ لاؤسا الکاٹ جب ''ننھی بیبیاں'' لکھ رہی تھی تو یہ کہانی اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں تھی۔ وہ اس سے تنگ آ چکی تھی۔ وہ اسے جلد سے جلد ختم کرنے کی متمنی تھی۔ لیکن یہ کہانی کسی آسیب کی طرح اس کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی۔ یہ کہانی لکھنے کے دوران وہ غصے میں قلم پھینک ڈالتی۔ اپنے کتے کو سیٹی بجا کر بلاتی اور بھاگتی ہوئی جنگل میں چلی جاتی۔ ایک روز وہ اس کہانی کا مسودہ بے زاری کے عالم میں پھینک کر شہر چلی گئی۔

یہ کتاب ختم کرنے کے بعد اس کا خیال یہ تھا کہ اس نے ایک ناکام ترین کہانی تحریر کی ہے۔ لیکن یہ کتاب شائع ہوئی تو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگی۔ پچھلے اسی سال سے یہ کتاب سب سے زیادہ فروخت ہوئی ہے۔ پانچ کروڑ سے زائد لوگ اس کتاب کا مطالعہ کرچکے ہیں۔ حال ہی میں لائبریریوں کی ایک منعقد کی جانے والی کانفرنس میں ''ننھی بیبیاں'' کو دنیا کی مقبول ترین لڑکیوں کی کتاب ٹھہرایا گیا ہے۔

جب لاؤسا جوان تھی تو لوگ اس کی حرکات کے باعث کسی حد تک اسے پاگل سمجھتے تھے۔ وہ سارا دن سیٹیاں بجاتی رہتی تھی۔ اچھی لڑکیاں سیٹیاں تو ہرگز نہیں بجاتیں۔ وہ لڑکوں کے ساتھ دوڑ لگاتی اور ایسا کرتے وقت وہ اپنا اسکرٹ گھٹنوں سے اوپر چڑھا لیتی۔ اچھی لڑکیاں ایسے نہیں کرتیں۔ بعض اوقات وہ سیب کے درخت پر چڑھ کر سارا سارا دن کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے مکان کے اردگرد رہنے والے افراد کا خیال تھا کہ اس لڑکی کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ یہ ضرور اپنے خاندان پر کوئی مصیبت لائے گی۔

لاؤسا الکاٹ اپنی بیمار ماں اور چھوٹی بہنوں کی کفالت کرنے کے لئے کہانیاں لکھنے پر مجبور تھی۔ اس کا باپ ایک تارک الدنیا اور خیالوں کی دنیا میں رہنے والا انسان تھا۔ وہ کبھی کبھار لوگوں کو جمع کر کے ایک آدھ تقریر جھاڑ دیتا تھا اور اس کے عوض اسے ایک آدھ پونڈ مل جایا کرتا تھا۔ حالانکہ لوگوں کو اس کی تقریر سننے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ وہ زیادہ

تر تو گھر میں بیٹھا کہنیوں پر خارش کرتا رہتا تھا اور سادہ زندگی کے گن گایا کرتا تھا۔ ادھر اس کی فیملی کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا تھا کہ دوسرے وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا۔

وہ ایک بڑا سخی اور نیک آدمی تھا۔ ایک دفعہ سردیوں میں اس نے اپنے گھر کا ایندھن ایک ضرورت مند خاندان کو دے دیا۔ جب اس کی بیوی اور بیٹیوں نے اس سے کہا کہ ان کا اپنا گھر اس قدر سرد ہے اور انہیں خود ان لکڑیوں کی ضرورت ہے تو اس نے جواب دیا کہ ''گھبرانے کی بات نہیں ہے خدا ہمیں خود لکڑیاں بھیج دے گا''۔ اس لئے اس گھر کے تمام افراد خود کو گرم کرنے کے لئے سرشام ہی لحافوں میں گھس گئے۔

اسی رات برفباری کا ایک بڑا طوفان آیا۔ دوسری صبح جب الکاٹ کا خاندان بیدار ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ رات کو جب طوفان آیا تو ان کے گھر کے سامنے سے کچھ کسان لکڑیاں اٹھائے گزر رہے تھے۔ طوفان سے بچنے کے لئے وہ اپنا بوجھ وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ لاؤسا کے باپ کو اس بات کا یقین تھا کہ یہ لکڑیاں خدا نے ان کے لئے بھیجی ہیں۔ اس لئے وہ انہیں اٹھا کر اندر لے آیا۔

جب لاؤسا الکاٹ نے پہلے پہلے اپنی کہانیاں ناشروں کو بھیجنی شروع کیں تو وہ انہیں ڈاک سے ہی واپس کر دیتے۔ ایک دفعہ ایک ایڈیٹر نے اسے لکھ بھیجا کہ وہ کبھی ہردلعزیز مصنفہ نہیں بن سکے گی۔ اس لئے اس نے اسے ہدایت کی کہ وہ یہ کام چھوڑ کر سینے پرونے کا کام شروع کردے اور یہ کام اس کے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔

وہ مکان جہاں لاؤسا الکاٹ رہتی تھی۔ آج کل اس کی دید کرنے کی خاطر ہر سال تقریباً پچیس ہزار لوگ وہاں آیا کرتے ہیں۔ بعض تو اسے ایک بڑی مقدس جگہ سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھے بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے ایک ایسی خاتون کو دیکھا جو کہ مکان کے کمروں میں گھومتے ہوئے زاروقطار رو رہی تھیں۔

ایک دفعہ ایک نوجوان نے لاؤسا الکاٹ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ناول نویس بننا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ اسے کچھ مشورہ دے۔ لاؤسا الکاٹ نے اسے جواب دیا۔

''بہتر ہوگا کہ اس کے علاوہ اور کوئی کام شروع کردو چاہے وہ قبریں کھودنے کا کام ہی کیوں نہ ہو۔''

مارک ٹوین

اس نے اپنا قرض اتارنے کے لئے عمرِ عزیز
کے چھ برس ملک ملک میں لیکچر دینے میں
ضائع کر دیئے۔

کیا آپ مقروض ہیں؟ کیا آپ نے ہمیشہ کاروبار میں دھوکا کھا کر اپنا پیسہ ضائع کیا ہے؟ تو آپ کے لئے یہ حقیقت باعث تسلی ہونی چاہئے کہ دُنیا کے بعض ذہین ترین افراد نے جب بھی کاروبار میں روپیہ لگایا تو گھاٹے میں رہے۔ مثلاً مارک ٹوین کو لے لیں، اس کے اندر ساری دنیا کو ہنسنے ہنسانے اور رلا دینے کی اہلیت تھی۔ اس کے باوجود کسی کاروبار میں روپیہ لگانے کے سلسلے میں اس کی قابلیت مجھ سے یا آپ سے زیادہ نہیں تھی۔

اس نے مختلف قسم کے کاروبار میں تقریباً بیس ہزار پونڈ لگائے تھے۔ لیکن اس کا یہ تمام سرمایہ تباہ ہو گیا۔ آخر ایک شخص نے اسے ٹیلیفون کے کاروبار میں روپیہ لگانے کی آفر کی۔ لیکن مختلف کاروبار میں ناکامیوں کے باعث مارک ٹوین کا حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ اگر وہ اس کاروبار میں بھی پیسہ لگاتا تو لاکھوں کا مالک ہوتا۔ اس نے وہی روپیہ اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ ایک اور کاروبار میں لگا دیا۔ آپ جانتے ہیں اس کا انجام کیا ہوا؟ مارک ٹوین دیوالیہ ہو گیا۔ اس کے گھر کی ہر ایک چیز بک گئی، سوائے ایک سٹوو کے۔

اس کے ایک دوست ایچ ایچ روجر نے اس کا قرضہ اتارنا چاہا۔ لیکن مارک ٹوین نے انکار کر دیا۔ اس کے مداحوں نے اسے چیک بھیجنے شروع کر دیئے۔ لیکن مارک ٹوین نے ان سب کے چیک واپس کر دیئے اور وہ اس بات پر مصر رہا کہ وہ اپنا قرضہ خود اتارے گا۔ اُسے لیکچر دینے سے نفرت تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنا قرضہ اتارنے کی خاطر دنیا

بھر کا چکر لگایا اور مختلف ممالک میں لیکچر دیئے۔ اس طرح اس نے اپنے زندگی کے چھ قیمتی سال لگا کر اپنا سارا قرض اتار دیا۔

جنرل گرانٹ اتنا ذہین تھا کہ اس نے ''لی'' کو فتح کیا۔ سول وار جیتی اور امریکہ کا صدر بنا۔ لیکن اپنی روزمرہ زندگی میں وہ اس قدر چاق و چوبند نہیں تھا۔ زندگی کے آخری سالوں میں دو گھاگ جعلسازوں نے اس پر ڈورے ڈالے اور اسے تجارت میں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب دی۔ ان لوگوں نے گرانٹ کی نیک نامی سے فائدہ اٹھا کر بڑے بڑے دھوکے کئے۔ اپنے دھوکے فریب سے انہوں نے تین لاکھ بیس ہزار پونڈ جمع کئے۔ پھر اچانک کاروبار میں سخت نقصان ہوا۔ اور لی نے اپنا قرضہ اتارنے کے لئے اپنا فارم، نیویارک اور ویلفیا میں اپنے مکانات کے علاوہ وہ تلواریں اور ٹرافیاں بھی بیچ دیں جو اسے تحفے کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔

اس کے پاس ایک بھی ڈالر نہ رہا تھا اور وہ سرطان سے مر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی پائی پائی کی محتاج ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے اپنی بیوی کے لئے کچھ نہ کچھ اثاثہ چھوڑنے کی خاطر اپنی زندگی کے حالات لکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس وقت تک لکھتا رہا جب تک سرطان نے اس کے گلے میں اتر کر اس آواز تک بند نہ کر دی۔ پھر اس نے نہایت اذیت کے عالم میں کتاب ختم کی۔ اس نے کتاب کا آخری باب اپنی موت سے تین دن پہلے مکمل کیا۔ مارک ٹوین نے وہ کتاب شائع کی اور مسز گرانٹ کو رائلٹی کے طور پر ایک لاکھ پونڈ دیا۔ عظیم ڈینئل ویبسٹر پر اس لئے مقدمہ چلایا گیا کہ وہ اپنے نصاب کا بل نہ ادا کر سکا تھا۔

عظیم ناول نگار آلیور گولڈسمتھ کو ایک دفعہ محض اس وجہ سے قید خانے جانا پڑا کہ وہ اپنے کمرے کا کرایہ ادا نہیں کر سکا تھا۔ لافانی فرانسیسی ناول نگار بالزک اس قدر مقروض رہا کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص اس کے دروازے کی گھنٹی بجاتا تو وہ جواب دینے سے ڈرتا تھا۔

انگلستان کا شہنشاہ چارلس دوم اتنا مقروض تھا کہ اس نے ولیم پن کو اپنی بہن سلوینیا والی جائداد صرف پندرہ ہزار پونڈ میں دے دی۔

ابراہام لنکن کی بیوی ایک بار اتنی مقروض ہو گئی کہ اسے اپنے کپڑے اور زیورات

تک بیچنے پڑے تھے اور نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ اس نے اپنے مرحوم خاوند کی ایک ایسی قمیض جس پر اس کے دستخط ثبت تھے فروخت کر دی۔

امریکہ کا عظیم آرٹسٹ وسلر بھی اکثر مقروض رہتا تھا۔ اور وہ اپنی تصاویر کو گروی رکھ کر اپنا قرض اتارتا۔ جب کبھی وسلر کا کوئی قرض خواہ اس کے گھر آ کر وسلر کی کرسی یا چارپائی پر بیٹھتا تو وسلر زمین پر اس کی تصویر کھینچ لیتا تھا۔

بیو برڈل آج سے سو سال پہلے برطانیہ کی سماجی زندگی کا بادشاہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے پاس اتنے سوٹ تھے کہ برطانیہ کے شہنشاہ کے پاس بھی اتنے نہ ہوں گے۔ اس کے باوجود وہ بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔ جب کبھی کوئی قرض خواہ اس سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرنے آتا تو بیو برڈ بھاگ کر اپنی کپڑوں والی الماری میں جا چھپتا۔ آخر کار اس کے قرض خواہوں نے اس پر مقدمہ چلا کر اسے قید کروا دیا۔

یہ آدمی ایک زمانے میں فیشن کی دنیا کی آنکھوں کا تارہ تھا۔ یہ آدمی کہ جس کا نام آج بھی لباس کی نفاست کے سلسلے میں سرفہرست آتا ہے۔ انجام کار اتنا غریب ہو گیا کہ گندے اور پھٹے ہوئے کپڑے پہننے لگتا۔ لوگ اسے دیکھ کر قہقہے لگاتے جنہیں کبھی وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا دماغ چل گیا۔ وہ ایک گندے مکان میں رہنے لگا اور بالآخر بڑی کسمپرسی کی حالت میں فوت ہوا۔ جوانی کے دنوں میں ابراہام لنکن نے ایک شرابی کے ساتھ کاروبار شروع کیا۔ کاروبار ناکام ہوا اور اس کا شرابی ساتھی بھی مر گیا۔ قرضہ ادا کرنے کے لئے بس لنکن ہی رہ گیا۔ قانونی طور پر اس مقدمے میں کئی ایک خامیاں تھیں اور لنکن صاف بچ سکتا تھا۔ لیکن ابراہام لنکن کا یہ وطیرہ نہ تھا۔ اس نے گیارہ سال تک دن رات محنت کر کے روپیہ جمع کیا اور اپنا قرضہ مع سود کے ادا کر دیا۔

سقراط دنیا کے عقل مند ترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن وہ اتنا غریب تھا کہ جب کبھی اس کا دل گوشت کھانے کو کرتا تو وہ قصائی سے ادھار لیا کرتا تھا۔ جب سقراط بستر مرگ پر پڑا تھا تو اسے یاد آیا کہ اس نے قصائی کے کچھ روپے دینے ہیں، سقراط کی زبان سے نکلنے والے آخری الفاظ میں اس نے اپنے ایک دوست کو قصائی کا قرضہ ادا کرنے کے لئے کہا تھا۔

میری رابرٹ رینی ہارٹ

اس نے اپنے شوہر کا قرض اتارنے کی غرض سے کہانیاں لکھنی شروع کیں اور بیسویں صدی کی نامور ناول نگار بن گئی۔

لاکھوں لوگ جن میں ممکن ہے کہ آپ بھی شامل ہوں، میری ہارٹ رینی کی کہانیوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اس نے چوالیس کتابیں اور رسالوں کے ہزاروں صفحات لکھے ہیں۔ اس کے باوجود بھی کہ جب اس نے لکھنا شروع کیا تو وہ تین بچوں کی ماں تھی، اس نے شہرت حاصل کرنے کے لئے لکھنا شروع نہیں کیا تھا بلکہ صرف اپنا قرضہ اتارنے کے لئے یہ کام کیا تھا۔

اس کی پہلی کہانی چھ پونڈ میں بکی، لیکن آج کل رسالوں کے ایڈیٹر اسے مضامین کا سلسلہ شروع کرنے کے عوض سات ہزار پونڈ دینے کو تیار ہیں۔ اس کا شمار امریکہ کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے ادباء میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ لکھنے کو ایک واہیات کام سمجھتی ہے۔

کسی زمانے میں وہ اپنی کہانیوں کے بڑے بڑے بنڈل صرف پندرہ پونڈ فی بنڈل کے حساب سے فلم بنانے والوں کو فروخت کیا کرتی تھی لیکن اس کے بعد ہالی وڈ کے ایک ڈائریکٹر نے دس ہزار پونڈ سالانہ کے حساب سے ہالی وڈ میں آ کر فلموں کے لئے کہانیاں لکھنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

کسی زمانے میں میری رینی ہارٹ کو مسلسل کئی آپریشنز کی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس نے لکھنا بند نہ کیا تھا۔ وہ ہسپتال میں چوری چھپے لکھا کرتی تھی۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ اگر میں اتنا عرصہ بستر پر گزارنے پر مجبور نہ ہوتی تو میں کبھی اتنی کتب نہ لکھ پاتی۔

ابتدا میں اس نے نظمیں لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ لیکن اس کی ایک بھی نظم فروخت نہ ہوئی۔ ایک بار اس نے بچوں کے لئے نظموں کی ایک کتاب لکھی اور کسی ناشر کی تلاش میں وہ لٹس برگ سے نیویارک چلی گئی۔ وہ کئی روز تک نیویارک کے بازاروں میں ایک پبلشر سے دوسرے پبلشر کی دکان تک گھومتی رہی۔ اس کے جوتے ٹوٹ گئے لیکن اسے اپنی اس بھاگ دوڑ کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کوئی پبلشر بھی اس کا یہ مجموعہ شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اس حادثے سے وہ بہت دل شکستہ ہوئی اور اس نے کہانیاں وغیرہ لکھنے کا خیال بالکل ذہن سے نکال دیا۔

پھر اچانک ہی غیر متوقع طور پر شکستہ حالی نے اسے آ لیا۔ اس نے کئی ایک کمپنیوں میں شیئرز خرید رکھے تھے۔ وہ کمپنی بری طرح ناکام ہوئی یہاں تک کہ وہ چوبیس پونڈ کے مقروض ہوگئے۔ صورت حال بڑی مایوس کن لگتی تھی۔ اس کا خاوند ایک فزیشن تھا۔ وہ کسی نہ کسی طور اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ لیکن کیسے؟ اس نے لکھنے کے بارے میں سوچا۔ لیکن وہ تو صبح سے شام تک گھر کے کاموں میں مصروف رہا کرتی تھی۔ رات کو بالکل تھک جاتی تھی۔ اس پر بھی اسے ہر دو گھنٹے کے بعد اٹھ کر اپنے چھوٹے بچے کے لئے دودھ گرم کرنا پڑتا تھا۔

پھر ایک شام کو ایسا ہوا کہ ڈاکٹر رینی ہارٹ ایک مریض کو دیکھ کر گھر آیا اور اس نے اپنی بیوی کو اس مرض کے بارے میں ایک عجیب وغریب کہانی سنائی۔ وہ مریض اپنی یادداشت کھو چکا تھا اور اب پھر خود کو جوان سمجھنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بیوی کوئی اجنبی عورت ہے اور جب اس سے یہ کہا جاتا کہ گھر میں ادھر ادھر پھرنے والے بچے اس کے ہیں تو قہقہے لگانے لگتا۔

مسز رینی ہارٹ اس کہانی سے بڑی متاثر ہوئی۔ اسی شام جب بچے سو گئے تو اس نے یہ کہانی لکھنا شروع کر دی۔ جب وہ مکمل ہوئی تو اسے ایک رسالے کو بھیج دیا۔ تھوڑے

دنوں بعد اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کی کہانی کو اشاعت کے لئے منظور کر لیا گیا ہے۔ اور اس کہانی کا معاوضہ اسے چھ پونڈ چیک کے ذریعے سے ارسال کر دیا گیا تھا۔ ایڈیٹر نے اس سے مزید کہانیاں لکھنے کی درخواست بھی کی تھی۔

پھر اس نے اپنے فالتو وقت میں کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ اگر آپ یہ سوچتے ہیں کہ اس کے پاس بہت سا فالتو وقت تھا تو آپ اس کے گھریلو حالات کے بارے میں بھی سنئے:

اس کا مکان تین منزلہ تھا۔ وہ اس سارے مکان کو بڑا صاف رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے تین بچوں اور شوہر کا بھی خیال کرنا پڑتا تھا۔ تین وقت کا کھانا تو وہ خود تیار کرتی تھی۔ چٹنیاں اور مربے بھی گھر پر ہی بناتی تھی۔ پھٹے پرانے کپڑے مرمت کرتی اور گھر کے سارے افراد کے کپڑے بھی خود ہی دھوتی تھی۔ اپنے بچوں کے کپڑے وہ سیتی بھی خود ہی تھی۔ اس کی ایک معذور ماں بھی تھی جس کی دیکھ بھال کی تمام تر ذمہ داری اس پر تھی۔ اپنے شوہر کے مریضوں کے بل بھی وہ خود ہی بناتی تھی اور دکان کا سارا حساب کتاب بھی وہ خود ہی کیا کرتی تھی۔ اسے لکھنے کے لئے بس رات کا وقت ہی ملا کرتا تھا۔

اس کے باوجود اس نے ایک سال کے اندر پینتالیس کہانیاں لکھیں اور ان سے اس نے تین سو ساٹھ پونڈ کمائے۔ میں تو یقینی طور اسے ایک معرکہ کہوں گا۔ سینیٹر پین روز کے مرنے کے تھوڑے دن بعد ہی رینی ہارٹ کا گھرانہ واشنگٹن میں اس کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ مسز رینی ہارٹ نے اپنی رہائش کے لئے اس کمرے کا انتخاب کیا جس میں سینیٹر پین روز فوت ہوا تھا۔ اس کے فوراً بعد اس کے ساتھ عجیب وغریب سے واقعات پیش آنے لگے۔ اس کی خواب گاہ کی گھنٹی بار بار خود بخود بجنے لگتی تھی۔ حالانکہ اس کے قریب اور کوئی ہوتا بھی نہ تھا۔ دروازے خود بخود کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ چمگادڑیں اور پرندے بڑے پراسرار انداز میں اس کے کمرے میں آ جاتیں۔ حالانکہ دروازے، کھڑکیاں اور روشندان بند ہوا کرتے تھے۔ اس کے پلنگ کے کناروں پر اچانک کوئی انگلیوں سے ساز بجانے لگتا تھا۔ اور آدھی رات کی خاموشی میں کمرے کے دروازے خود بخود کھل جاتے۔ رات کے دو بجے ٹائپ رائٹر پر خود بخود غیبی انگلیاں حرکت کرتیں۔ ایک کتا کمرے میں گھومتا پھرتا اور اچانک

خوفزدہ آنکھوں سے اسے دیکھنے لگتا۔ میز اور کرسیاں کمرے میں خود بخود چلنے لگتیں اور رات کو کمرے کے گوشوں سے عجیب سی آسیب زدہ آوازیں سنائی دیتیں۔

مسز رینی ہارٹ یہ سب دیکھ کر بڑی چوکس ہو گئی اور اسے سوتے میں دورے پڑنے لگتے۔ ان کا ایک دوست تھا جو کہ روحانیت کا ماہر تھا۔ اس نے مسز رینی ہارٹ کو مشورہ دیا کہ جب وہ کمرے میں آوازیں سنے تو زور زور سے بولنے کی کوشش کرے۔ وہ ان سے پوچھے کہ وہ یہاں کیا لینے آئے ہیں اور وہ ان کے لئے کیا کر سکتی ہے۔

دوسرے روز اس کے کمرے کی کھڑکی خود بخود بند ہو گئی۔ مسز رینی ہارٹ اپنے بستر سے نکلی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر لرزتی کانپتی ہوئی آواز میں روح سے پوچھنے لگی کہ وہ یہاں کیا لینے آئی ہے۔ اتنے میں اچانک نیچے والے ہال کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ پھر یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے گھنٹی کے بٹن پر جھکی ہوئی ہے۔

مسز رینی ہارٹ کو بھوتوں وغیرہ پر بالکل بھی یقین نہیں تھا۔ وہ یہ بات ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی کہ سینیٹر پین روز کی روح مکان میں گھومتی پھرتی ہے۔ اپنے الفاظ میں وہ اس حادثے کو ایسے بیان کرتی ہے۔

"بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیبی دنیا سے کوئی ننھی منی روح اتر کر ہمارے درمیان میں کھیلنے لگتی ہے۔"

بڑے لوگ

حضرت مسیح علیہ السلام

انگلینڈ میں کئی برس یہ قانون نافذ رہا کہ 25 دسمبر کو کرسمس منانے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔

تین سو سال قبل جب انگلینڈ برطانیہ کی ایک دور افتادہ نو آبادی تھا تو ریاست میسا چوسٹس کے ایک گاؤں کی ایک عورت اسی گاؤں کی ایک دوسری عورت کے پاس گئی جو کہ کرسمس منا رہی تھی۔ کرسمس منانے والی عورت جرمن نژاد تھی اور اس نے سفیدے کا ایک درخت جسے وہ کھیتوں میں سے کاٹ کر لائی تھی اپنے مکان کے صحن میں گاڑا ہوا تھا اور اسے اچھی طرح سجا رکھا تھا۔ اس کے بچے اس درخت کے گرد ناچ رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش کے گیت بھی گا رہے تھے۔ وہ مکمل جوش و خروش سے کرسمس کا تہوار منا رہے تھے۔ آخر اس میں برائی ہی کیا ہے۔

لیکن اس زمانے کے امریکہ کے پیورٹین حکمرانوں کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اس جرمن عورت کو گاؤں کے جرگہ میں پیش ہونے کا حکم دیا اور کرسمس منانے کے جرم میں اسے گاؤں اور مذہب سے بے دخل کر دیا گیا۔

آخر اس عورت نے ایسی کون سی غلطی کی تھی۔ وہ کرسمس منانے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اپنی حکمرانی کے دور میں انہوں نے کرسمس کی چھٹی بھی بند کر دی تھی اور اسے خدا کی توہین سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک قانون بھی پاس کروالیا تھا۔ اس قانون کی رو سے اگر کوئی شخص کرسمس مناتا ہوا پکڑا جاتا تو جرمانے کے ساتھ ساتھ عوام کے سامنے اس

کی بڑی بے عزتی کی جاتی۔

خشک مزاج کراموبل کے دور حکومت میں بھی یہی کچھ ہوتا رہا تھا۔ ان دنوں سارا انگلینڈ کسی سوگوار بیوہ کی مانند نظر آتا تھا۔ اس نے بھی کرسمس منانے پر کڑی پابندی عائد کر رکھی تھی لیکن کرسمس کے خلاف ایسا سخت قدم کیوں اٹھایا گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ پیورٹن کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کرسمس کے دن پیدا نہیں ہوئے تھے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے دو سو سال کے بعد مؤرخین نے ان کا یوم پیدائش معلوم کرنے کی خاطر تگ و دو شروع کر دی۔ بعض کا خیال تھا کہ وہ 25 مئی کو پیدا ہوئے تھے۔ بعض کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام 19 اپریل کو دنیا میں آئے۔ بعد کے مؤرخین نے یہ دونوں تواریخ جھوٹی ثابت کر دیں اور دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام 17 نومبر کو پیدا ہوئے تھے۔ جدید مؤرخین کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے پیدائش کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بیت الحوم جہاں حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے تھے وہاں بھی سال میں تین بار مختلف اوقات میں کرسمس منایا جاتا ہے۔ ایک گروہ ۲۵ دسمبر کو کرسمس مناتا ہے۔ دوسرا گروہ ۴ جنوری کو مناتا ہے جبکہ تیسرا گروہ ۱۸ جنوری کو۔ ایبے سینا میں مارچ کے مہینے کے علاوہ سلدا سال ہر ماہ کرسمس منایا جاتا ہے۔

شاید آپ کے لئے بھی یہ ایک نئی بات ہو کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے آٹھ سو سال بعد عیسوی سال شروع ہوا تھا۔

رومن کئی ہزار سال تک ۲۵ دسمبر کو سرطانالیہ نامی ایک تہوار مناتے رہتے تھے۔ سرطان کو وہ زراعت کا دیوتا مانتے تھے۔ ہر سال فصلوں کی کٹائی کے بعد وہ سرطان کے احترام میں ایک تہوار منایا کرتے تھے اور اس دن خوب جشن کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے، اپنے گھروں کو اچھا سجاتے اور بچوں کو کھلونے خرید کر دیا کرتے۔

جب عیسائیت روم کا سرکاری مذہب قرار پائی اور اس وقت کے رومن حکمرانوں نے یہ قانون منظور کیا کہ سرطانالیہ تہوار کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کا یوم پیدائش بھی منایا

جائے گا تو اس طرح سے دو تہوار ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

کرسمس کے بارے میں بہت سی عجیب و غریب توہمات سننے میں آتی ہیں۔ بڑی بوڑھیوں کی زبان سے اکثر یہ سنا گیا ہے کہ کرسمس کی آدھی شب کو شہد کی مکھیاں بائبل کی سو تمثیلات گنگناتی ہیں۔ اور بھیڑیں بیت الھوم کا لفظ پکارتی ہیں۔

میری ایک خاتون سیکرٹری لاؤسیانہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہاں حبشیوں نے اسے یہ سکھار کھا تھا کہ کرسمس کی رات کو گائیں اپنے گھٹنوں کے بل جھکتی ہیں اور دوسری گائیوں سے بات کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ لاؤسیانہ میں ایسا ہوتا ہو۔ مگر کسی دور میں جنوبی ڈیکوٹا میں مَیں خود کاؤبوائے ہوتا تھا۔ اگر لاؤسیانہ میں گائیں کرسمس کے روز باتیں کر سکتی ہیں تو جنوبی ڈیکوٹا میں بھی ایسا ہوتا ہوگا۔ ویسے ایک بات ہے کہ میں ان کی زبان سمجھنے سے قاصر تھا۔

بوڑھا سانتا کلاز جو کہ کرسمس کی شب کو آپ کے گھر میں چپکے سے داخل ہو جاتا ہے لوگوں کا پہلا دیوتا تھا۔ وہ روم کے بچوں کے لئے ہزاروں سال تک تحفے تحائف لاتا رہا تھا۔ جب وہ شمال سے وارد ہوتا ہے تو گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ دوسرے دیوتاؤں کی مانند اس کا مسکن بھی قطبی ستارے کے پاس ہے۔

آج کے دور میں کرسمس کے بارے میں اختلافات کی پرواہ کون کرتا ہے۔ آج تو مغربی دنیا میں اسے ایک خوشگوار چھٹی سمجھا جاتا ہے۔

لینن

کسی زمانے میں وہ دربدر مارا پھرتا تھا لیکن
آج اس کی پوجا ہوتی ہے۔

میں آپ کو ایک ایسے آدمی کے بارے میں بتاتا ہوں جسے مرے ہوئے ستر سال ہو چکے ہیں۔ اور اس کے باوجود اس کے نام پر ایک شہر کا نام رکھا گیا ہے اور دس کروڑ انسان اسے مجازی خدا سمجھتے ہیں۔ اس کا نام لینن تھا۔ اس نے روس میں دنیا کے ایک عظیم ترین معاشی تجربے کا آغاز کیا۔ یہ ممکن نہیں کہ اس تجربے کا اثر مجھ پر، آپ پر، بلکہ ہر شخص پر نہ پڑے۔

لینن پستہ قد کا حامل تھا۔ وہ گنجا اور جھریوں زدہ آدمی تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوتا تو اس کے پیر زمین تک نہیں جاتے تھے۔ اسے اپنے لباس اور حلیے کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ عام طور پر اس کی پتلون ضرورت سے زیادہ لمبی ہوتی تھی۔ اس کی ناک ذرا سی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ یقینی طور پر اس نے ساری عمر کبھی ریشمی ہیٹ یا فراک کوٹ نہیں پہنا ہوگا۔ اس کی ازدواجی زندگی بہر حال پر مسرت تھی۔ اس کی بیوی اس سے اتنا پیار کرتی تھی کہ جب لینن جلاوطن ہوا تو وہ اس سے جدا ہونے پر رضامند نہ ہوئی۔ اس نے لینن کے ساتھ ہی جلاوطنی اختیار کی تھی۔ وہ اپنے شوہر کی دیکھ بھال کرنا چاہتی تھی۔

جب وہ سائبیریا میں خانساماں تھا تو اس کے پاس بہت وقت ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ شطرنج کا ایک نامور کھلاڑی بن گیا۔ وہ ایک وقت میں کئی کھلاڑیوں کے ساتھ شطرنج کھیل سکتا تھا۔ وہ شطرنج کا اس قدر دلدادہ ہو گیا تھا کہ وہ دور دراز رہائش پذیر دوستوں سے بذریعہ ڈاک شطرنج کھیلا کرتا تھا۔

بچپن میں لینن بڑا سنجیدہ اور اداس رہا کرتا تھا۔ وہ شاذونادر ہی دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ اس نے کبھی کسرت سے کھیل نہ کھیلے تھے۔ جب وہ جوان ہوا تو اس

نے موسیقی، شاعری یا مذہب میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ البتہ اس نے قانون کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ چار زبانیں بول سکتا تھا یعنی، فرانسیسی، روسی، جرمن اور انگریزی۔

روسی حکومت نے اس کے بھائی کو پھانسی کی سزا دی تھی کیونکہ اس نے الیگزینڈر سوم کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعد میں حکومت نے لینن کو بھی اس وجہ سے جلاوطن کر دیا کہ وہ انتہا پسندانہ خیالات رکھتا تھا۔ اسے جلاوطن کر کے برفانی سائبیریا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں لینن نے خود اپنی آنکھوں سے روسی دہقانوں کی المناک مفلسی کا منظر دیکھا۔ وہ اس قدر مفلس تھے کہ بس بڑے بڑے تہواروں کے موقع پر ہی ان بے چاروں کو گوشت نصیب ہوتا تھا۔ یعنی کہ سال کے صرف بیس دن انہیں گوشت ملتا تھا۔

1891ء کی زبردست قحط سالی میں جب لاکھوں غربت زدہ اور فاقہ زدہ کسان ٹائیفائیڈ اور ہیضے کا شکار ہو کر مر گئے تو لینن کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ کوئی انتہائی اقدام کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس کے بعد وہ آتش خو انقلاب پرست بن گیا۔

اگلے پچیس سال میں وہ مختلف ممالک میں گھومتا پھرتا رہا۔ کبھی اسے اس ملک سے باہر نکالا جاتا اور کبھی اس ملک سے۔ اس نے مختلف اوقات میں جرمنی، آسٹریا، فرانس، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ اور انگلستان میں زندگی بتائی۔ جب وہ انگلستان میں تھا تو گھنٹوں کارل مارکس کی قبر پر بیٹھا رہتا تھا۔ کارل مارکس اشتراکیت کا بانی تھا۔ کبھی کبھی وہ گرفتاری سے بچنے کی خاطر کسان یا ملاح یا فیکٹری مزدور کا بہروپ بھر لیتا۔ کبھی نقلی گل مچھے لگاتا، کبھی عورت کا بھیس بدل کر گھومتا پھرتا۔ جب بھی وہ سفر کرتا تھا تو اس کے صندوق میں ایک خفیہ پیندا ہوتا تھا۔ اس میں اس کے خفیہ کاغذات اور خطرناک دستاویزات ہوتی تھیں۔ کبھی وہ اپنی خفیہ دستاویزات اپنے ترکاری کے باغ میں دبا کر اوران کے اوپر پیاز اور کرم کلے بو دیا کرتا تھا۔

اس نے جیل میں ایک انقلابی کتاب تحریر کی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کتاب کے بارے میں حکام کو پتہ نہ چلے۔ اس نے اسے سیاہی کی بجائے دودھ سے تحریر کیا تھا۔ جب ایسی تحریر کو گرم پانی میں ڈبویا جاتا تو الفاظ ظاہر ہوتے۔ اس نے یہ فن اپنے شاگردوں کو بھی سکھا رکھا تھا۔ وہ بھی خط لکھتے وقت یہی طریقہ کار استعمال کیا کرتے تھے۔ جب لینن کے پاس ایسا کوئی خط آتا تو وہ جیل کے پہرے دار سے چائے منگواتا اور آنکھ بچا کر خط کو چائے

میں ڈبوتا اور خفیہ تحریر پڑھ لیا کرتا۔

نومبر 1917ء میں لینن روس کا ڈکٹیٹر بنا اور اس نے ساری املاک بحق سرکار ضبط کر لیں۔ جب کسانوں نے قبضہ کرنا شروع کیا تو بڑے بڑے جاگیردار دہشت کے مارے ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسانوں نے بڑے بڑے نادر اور نفیس مشجر پردے کو کاٹ کر جوتے بنائے اور جن انمول گلدانوں کو یورپ کے استاد کوزہ گروں نے تیار کیا تھا انہیں اچار کے مرتبان کے طور پر استعمال کیا گیا۔ روس اس وقت قحط کا شکار تھا اور لینن اس لئے چائے میں شکر نہیں ڈالتا تھا کہ دوسرے لوگ بھی شکر سے محروم تھے۔ حالانکہ وہ روس کا سب سے بڑا حکمران تھا لیکن وہ خود معمولی سے معمولی سامان تعیش بھی استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس نے سیکریٹریوں کے عملے کے بغیر روس پر حکومت کی اور شاذ و نادر ہی کسی اور سے اپنا خط لکھوایا۔ وہ روزانہ اٹھارہ بیس گھنٹے کام کیا کرتا تھا اور اپنے سارے خطوط خود ہی لکھا کرتا تھا۔

پانچ سال کے بعد اسے شریانوں کی سختی کی بیماری ہو گئی اور اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ فالج کے اثر سے وہ بولنے سے معذور ہو گیا اور اسے کسی بچے کی مانند دوبارہ بولنا سیکھنا پڑا۔ اس کا دایاں ہاتھ فالج سے بیکار ہو گیا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے لکھنا سیکھ لیا۔ دو سال تک وہ بے جگری سے موت کا مقابلہ کرتا رہا اور بار بار یہی کہتا رہا کہ ابھی مجھے بہت سا کام کرنا ہے۔ آج روس میں ہر جگہ ہر مزدور کلب میں، ہر کارخانے میں اور تقریباً ہر گھر میں اس کی تصویر ٹنگی نظر آتی ہے۔ نانبائی اپنے کیک پر اس کی شکل بناتے ہیں۔ لاکھوں آدمی اسے اس طرح سے پوجتے ہیں کہ جیسے وہ خدا ہو، اور کسانوں میں تو یہ قصے بھی مشہور ہو چکے ہیں کہ وہ کسی مشکل میں گرفتار مزدور کی مدد کرنے کی خاطر قبر سے اٹھ کر آ جاتا ہے۔

اب اس کی مسالے سے محفوظ کی گئی لاش ایک شیشے کے صندوق میں بند ہے اور شاید اس وقت بھی سینکڑوں مؤدب زائر سروں سے ٹوپیاں اتار کر، اس صندوق کے پاس سے گزر رہے ہوں گے۔ ہر روز کم از کم ایک ہزار آدمی اس کی لاش کو دیکھنے آتے ہیں۔ اور اس وقت بھی سرخ سپاہی سنگینیں تان کر اس آدمی پر پہرہ دے رہے ہوں گے جس نے دنیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

مہاتما گاندھی

جو پہلی مرتبہ ایک وکیل کی حیثیت سے عدالت
میں گیا تو اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں اور
بولنے سے پہلے اس کا گلا رندھ گیا۔

نصف صدی قبل ہندوستان میں ایک چھوٹے سے قد کا آدمی تھا جو دھوتی پہنے ہوتا تھا۔ اکثر چارپائی پر لیٹا مرن بھرت کا اعلان کر دیا کرتا۔ ساری دنیا کے اخبارات نمایاں حروف میں یہ خبر شائع کیا کرتے تھے۔ یہ شخص مہاتما گاندھی تھا۔ جو اپنے زمانے کی ایک عظیم شخصیت تھا۔

جہاں تک دولت کا تعلق ہے تو مہاتما گاندھی ایک غریب آدمی تھا۔ اگر وہ اپنی ساری جائداد فروخت کر دیتا تو اسے تین پونڈ سے زائد نہ ملتے۔ اس کے باوجود وہ دنیا کے امیر ترین افراد سے زیادہ بااثر ہے۔

جسمانی طور پر وہ بڑا کمزور تھا۔ وہ تشدد کا بالکل حامی نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی تعلیمات اور روحانی اثرات سینکڑوں جنگی جہازوں سے زیادہ تھے۔

دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستان کا باشندہ ہے۔ صدیوں سے ہندوستان کے لوگ سوئے پڑے تھے۔ پھر اس چھوٹے سے آدمی نے کہ جس کا وزن ایک سو پونڈ سے بھی کم تھا۔ اپنے ہم وطنوں کو ان کی بے پناہ قوت کا احساس دلایا اور اس نے ایسی اصلاحات کا اجراء کیا جو تاریخ عالم میں بڑا گہرا اثر رکھتی ہیں۔

گاندھی ایک عجیب وغریب انسان تھا۔ مثلاً اس کے سارے دانت مصنوعی تھے۔ ان دانتوں کو وہ اپنی دھوتی کے ڈب میں ڈالے رکھتا تھا اور صرف کھانے کے وقت انہیں

نکالتا۔ کھانے کے بعد وہ دانتوں کو صاف کر کے دوبارہ ڈب میں رکھ دیتا۔

وہ آئرش انداز کی انگریزی بولا کرتا کیونکہ اس کا ایک استاد آئرلینڈ کا رہائشی تھا۔ وہ صرف دھوتی باندھا کرتا تھا۔ جب وہ لندن میں تھا تو سوٹ کے ساتھ سر پر ریشمی فلٹ پہنتا اور ہاتھ میں چھڑی تھامے رکھتا۔

جب وہ پہلی بار ایک مقدمے کے سلسلے میں عدالت میں آیا اور اپنے موکل کے حق میں بولنے لگا تو اس کی ٹانگیں لرزیدہ ہو گئیں اور وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ گھبرا کر بیٹھ گیا اور ایک قسم کا احساس شکست اس پر حاوی ہو گیا۔

ایک وکیل کی حیثیت سے وہ لندن میں بالکل ناکام رہا تھا۔ کئی سال پہلے جب وہ انگلینڈ میں وارد ہوا اور اس کے آئرش استاد نے اسے بائبل میں سے "پہاڑ پر دعا" بار بار نقل کرنے کے لئے کہا تا کہ اس کی انگریزی لکھنے کی خوب مشق ہو جائے تو گاندھی کئی گھنٹے تک بیٹھا یہ جملے لکھتا رہتا۔ "وہ لوگ مبارک ہیں جو کہ مسکین ہیں۔ کیونکہ وہی زمین کے وارث ہوں گے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو امن پسند ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔" ان الفاظ کا گاندھی پر گہرا اثر ہوا۔

تھوڑے عرصے کے بعد اسے بہت سارے قرضے جمع کرنے کے لئے جنوبی افریقہ میں بھیجا گیا۔ وہاں پر اس نے "پہاڑ پر دعا" کے فلسفے کو آزمانے کی کوشش کی اور کامیاب رہا۔ عدالت کے باہر موکل پرامن طور پر جمع ہو گئے اور اس طرح سے ان کا پیسہ اور وقت بچ گیا۔ جلد ہی گاندھی کی سالانہ آمدنی تین ہزار پونڈ ہو گئی اور یہ مسکین زمین کا وارث بننے لگا۔

لیکن کیا وہ خوش تھا؟ بالکل بھی نہیں۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے لاکھوں ہم وطن نیم حیوانی زندگی گزار رہے تھے۔ اس نے بھوک کے مارے سینکڑوں آدمیوں کو مرتے دیکھا تھا۔ اسے دنیوی کامیابی بے معنی محسوس ہوئی اس لئے اس نے اپنا سارا سرمایہ لٹا دیا اور اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اپنے ملک اور اس کے غریب باشندوں کی حالت سدھارنے کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دے گا۔

گاندھی نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کم از کم غذا پر گزر اوقات کر سکتا ہے۔ کئی

تجربات کئے، بعد میں وہ بکری کے دودھ، پھلوں اور زیتون کے تیل پر گزر بسر کرنے لگا۔

گاندھی ڈیوڈ تھوریو نام کے ایک امریکی کی تعلیمات سے بڑا متاثر ہوا۔ تھوریو نے قریباً ایک سو بیس سال پہلے ہاورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے چھ پونڈ خرچ کئے اور ریاست میساچوسٹس میں والڈن پانڈ کے کنارے تنہائی میں ایک چھوٹا سا کمرہ تعمیر کیا اور وہاں ایک تارک الدنیا کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ جب اس سے مختلف قسم کے ٹیکسوں کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں وہ قید میں ڈالا گیا پھر اس نے سول نافرمانی پر ایک کتاب تحریر کی اور بتایا کہ کسی شخص کو بھی ٹیکس ادا نہیں کرنے چاہئیں۔ لوگوں نے اس وقت تو کتاب پر ذرہ برابر توجہ نہ دی لیکن نوے سال کے بعد جب گاندھی نے ہندوستان میں اس کی کتاب کا مطالعہ کیا تو اس میں درج فارمولوں کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ برطانیہ نے اپنے وعدے کے مطابق ابھی تک ہندوستان کو آزاد نہیں کیا تھا۔ اس لئے برطانیہ کو سزا دینے کی خاطر گاندھی نے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ قید خانے کو ٹیکس پر ترجیح دیں۔ اس نے اپنے ماننے والوں سے کہا کہ ہر قسم کے انگریزی مال کا بائیکاٹ کر دیں۔ جب انگریزوں نے نمک پر ٹیکس لگا دیا تو گاندھی اپنے حواریوں کے ساتھ ساحل سمندر پر خود نمک بنانے کے لئے چلا گیا۔

ہندوستان میں چھ کروڑ اچھوت رہتے ہیں۔ ہندو انہیں نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور خود پر ان کا سایہ تک نہیں پڑنے دیتے۔ اگر کسی اچھوت کا سایہ کسی ہندو کے کھانے پر پڑ جائے تو وہ کھانا قابل استعمال نہیں سمجھا جاتا۔ ہندوستان میں ان کی حالت قابل رحم ہے۔ لیکن گاندھی نے ان کے حقوق منوانے اور انہیں معاشرے میں ایک باعزت مقام دلانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اس نے ایک اچھوت بچی کو اپنا رکھا تھا۔ اور حقیقی بچی کی طرح اس کی پرورش کی تھی۔

لاکھوں ہندو مہاتما گاندھی کو ''ولی'' سمجھتے تھے۔ بعض کے نزدیک وہ کسی ہندو دیوتا کا اوتار تھا۔ اس خود غرض اور لالچ سے بھری ہوئی دنیا میں اس شخص نے دوسروں کو زندہ رہنے کے حقوق دلانے کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دی۔

تاجر

ایف ڈبلیو وول ورتھ

وہ کاروبار سیکھنے کی خاطر مفت کام کرنا چاہتا تھا
ہر دوکاندار اسے کند ذہن سمجھ کر چند دنوں بعد
دوکان سے نکال دیتا۔

جب باربرا ہٹن کی عمر اکیس سال ہوئی تو اس نے اپنے گھر میں ایک شاندار دعوت دی۔ اس نے ملک کا بہترین آرکیسٹرا بلایا تھا۔ اس سب ہنگامے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک دن میں چالیس لاکھ پونڈ کمائے تھے۔

لیکن یہ چالیس لاکھ پونڈ کہاں سے آئے تھے۔ اس کا ایک حصہ میری اور آپ کی جیبوں سے۔

باربرا ہٹن گرانٹ فرینک وول ورتھ کی پوتی ہے۔ جتنی بار آپ ''چھ پنس وول ورتھ'' کے کسی سٹور سے کوئی چیز خریدتے ہیں تو اس رقم کا ایک حصہ اس نوجوان گھنگھریالے بالوں والی عورت کو مل جاتا ہے۔

اس لڑکی کے دادا نے اتنا روپیہ کیسے کمایا؟ شروع میں تو اس کا دادا بڑا ہی غریب تھا۔ وہ نیویارک کے نزدیک واٹرٹاؤن میں اپنے ایک فارم پر گزر اوقات کیا کرتا تھا۔ وہ اس قدر غریب تھا کہ وہ سال میں چھ ماہ ننگے پاؤں رہا کرتا تھا۔ اس کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے کہ سردیوں میں خود کو ظالم سردی سے بچانے کے لئے ایک کوٹ ہی خرید لے۔

اس غربت اور تنگ دستی نے اسے جینے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس

کے اندر دنیا میں کامیاب ہونے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے فارم سے نفرت تھی۔ وہ ایک دکاندار بننے کا خواہشمند تھا۔ جب وہ اکیس سال کا ہوا تو اس نے اپنی گھوڑی گاڑی میں جوتی اور نیویارک کے کارخانہ تھیج نام کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس نے کسی دکان پر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی دکاندار بھی اسے ملازم رکھنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس کے کپڑے میلے اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سیلز مین کے لئے صاف کپڑوں کا ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔

آخر کار ایک ریلوے اسٹیشن پر ایک دکاندار نے اسے ملازم رکھ ہی لیا۔ یہ ملازمت اس نے صرف تجربہ حاصل کرنے کی خاطر کی تھی اور اس کے عوض اسے کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔

بعد میں اسے ایک اور دکان پر ملازمت مل گئی لیکن اس کے نئے مالکوں کا خیال تھا کہ وہ اتنا عقل مند نہیں تھا کہ گاہکوں کو نمٹا سکے۔ اس لئے وہ اسے صبح سویرے آنے کے لئے کہا کرتے۔ دکان پر آ کر وہ سب سے پہلے آگ جلاتا، دکان میں جھاڑو لگاتا اور کھڑکیوں وغیرہ کی صفائی کرتا۔ اسے کسی چیز کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوائے اس کہ جب دکان پر گاہکوں کا زیادہ رش ہو جاتا۔ جہاں تک تنخواہ کا تعلق تھا، اس کے مالکوں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ وہ اسے چھ ماہ تک کوئی تنخواہ نہیں دیں گے۔ اس نے انہیں بتایا کہ اس کے پاس دس پونڈ تھے جو اس نے گزشتہ دس سال میں فارم پر کام کر کے کمائے تھے۔ دنیا میں اس کی ساری پونجی بس یہی تھی۔ اس لئے وول ورتھ نے اپنے مالکوں سے عرض کیا کہ اگر وہ اسے دو چار آنے دے دیا کریں تو وہ ان کے یہاں کام کرنے کو تیار ہے۔ باقی کا خرچ وہ خود برداشت کر لیا کرے گا۔ اس طرح دو چار دنوں میں اسے پندرہ گھنٹے اس دکان میں کام کرنا پڑتا تھا۔

آخر کار اسے ایک دوسری دکان پر دس پنس فی ہفتہ کے حساب سے ملازمت مل گئی۔ اس کا کام رات کو دکان کی نگرانی کرنا تھا۔ لیکن یہ جگہ اس کے لئے بڑی پریشان کن تھی، اس کا مالک ہر وقت اس پر بگڑتا رہتا تھا اسے لعنت ملامت کرتا اور دھمکی دیتا کہ وہ اس کی تنخواہ میں کمی کر دے گا اور اسے گولی مار دے گا۔ وول ورتھ دکانداروں کی ان بدسلوکیوں

سے بڑا دل شکستہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے فارم پر واپس چلا گیا۔ وہاں وہ سال بھر بیمار رہا اور کوئی کام نہ کر سکا۔

ذرا سوچیں کہ تقدیر نے جس آدمی کو دنیا کا سب سے بڑا پرچون فروش بنانا تھا، اس وقت وہ اس قدر ہمت ہار چکا تھا کہ اس نے کاروبار کے بارے میں ہر خیال اپنے دماغ سے نکال پھینکا تھا اور اپنے فارم پر مرغیوں کی پرورش کرنے لگا۔

پھر ایک دن اسے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس کے سابقہ مالکوں میں سے ایک نے اسے ملازمت کے لئے بلایا تھا۔ وہ مارچ کا ایک سرد ترین دن تھا۔ ساری زمین برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ وول ورتھ کا باپ اس دن آلوؤں کی کچھ بوریاں گاڑی میں لاد کر منڈی میں لے جا رہا تھا۔ اس لئے وول ورتھ بھی گاڑی پر جا چڑھا اور ایک بوری پر سکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسے کیا پتہ تھا کہ اس کا موجودہ سفر اسے اتنا امیر بنا دے گا کہ اتنی دولت کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ صرف یہ کہ اسے ایک عظیم خیال آیا تھا۔ اس نے ساٹھ پونڈ ادھار لئے اور ایک ایسی دکان شروع کی جہاں کسی بھی چیز کی قیمت چھ پنس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی یہ پہلی دکان ناکام ثابت ہوئی۔ اس قسم کی اس نے چار دکانیں کھولیں جن میں سے تین ناکام ہوئیں۔

مزید قرضہ اٹھانے سے گھبرا کر اس نے ایک ہی دکان کو آہستہ آہستہ وسعت دینی شروع کر دی۔ جب وہ چل پڑی تو اگلے دس سالوں میں اس نے اس قسم کی مزید بارہ دکانیں کھول لیں۔ آخر کار وہ امریکہ کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ اس زمانے میں اس نے ڈھائی لاکھ پونڈ خرچ کر کے اپنے دفتر کے لئے دنیا کی بلند ترین عمارت بنوائی۔

کئی سال قبل جب وہ ایک غریب نوجوان تھا، اور بار بار شکست کھانے کی وجہ سے اپنی خود اعتمادی کھو چکا تھا تو اس کی ماں اسے کہا کرتی تھی، ''میرے بیٹے! دل چھوٹا نہ کر، ایک دن تم امیر آدمی بن جاؤ گے۔''

کارنیلئس وینڈر بلٹ

وہ چیک بک کے بجائے عام سادہ کاغذ استعمال کرتا اور بنک والے وہ کاغذ خوشی خوشی قبول کر لیتے۔

اگر آپ کو کسی شخص سے 80,00,000 پونڈ مل جائیں تو آپ کے دل کی کیا حالت ہو گی؟ نوجوان الفرڈ وینڈر بلٹ جب اپنی اکیسویں سالگرہ منا رہا تھا تو اس کے ساتھ یہی خوشگوار واقعہ پیش آیا۔

آپ کو یہ بات کتنی عجیب ہی کیوں نہ لگے، نوجوان الفرڈ وینڈر بلٹ کسی سکول یا کالج کا تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس نے دنیا میں گھوم پھر کر تجربات کی روشنی میں علم حاصل کیا ہے۔ وہ افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں گیا اور ہاتھیوں اور شیروں اور زرافوں کے بارے میں فلمیں بناتا رہا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران اس کا باپ الفرڈ وینڈر بلٹ سینئر ایک جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ جرمن آبدوز نے اس کی کشتی میں سوراخ کر دیا۔ اگرچہ وہ ایک نامور کھلاڑی تھا لیکن اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ جب جہاز ڈوب رہا تھا تو اسے ایک لائف بوٹ میں جگہ دے دی گئی۔ ابھی وہ اپنی جگہ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک عورت بھاگی بھاگی آئی اور کشتی میں بیٹھنے کے لئے منتیں کرنے لگی۔ الفرڈ وینڈر بلٹ نے اسے اپنی جگہ دے دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت روتی چلاتی اور اپنے بال نوچتی ادھر سے گزر رہی تھی۔ وہ شکوہ کناں تھی کہ اسے لائف

بیلٹ نہیں ملی تھی۔ وینڈربلٹ نے اپنی لائف بیلٹ اتار کر اس عورت کو دے دی۔

چند منٹوں کے بعد جہاز ڈوب گیا اور اس کے ساتھ الفرڈ وینڈربلٹ بھی۔ وہ ایک شریف آدمی تھا اور بہادری کی موت مرا تھا۔

وینڈربلٹ خاندان کا بانی دراصل کارنیلس وینڈربلٹ تھا۔ وہ ایک مضحکہ خیز شخص تھا۔ اس کا ایک مجسمہ ابھی تک نیویارک کے گرینڈ سنٹرل سٹیشن کے سامنے نصب ہے۔

کارنیلس وینڈربلٹ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل جزیرہ سٹیٹن میں پیدا ہوا تھا۔ جب وہ سولہ سال کا تھا تو اس نے اپنی ماں سے بیس پونڈ ادھار لئے اور ایک چھوٹی سی کشتی خرید لی اور جزیرہ سٹیٹن سے مسافروں کو نیویارک لے جانے لگا۔

آپ کے خیال میں ان بیس پونڈز سے اس نے کتنا کمایا ہوگا۔ دو کروڑ پونڈ! یہ کیسے ممکن ہے؟ اس نے یہ سب کیسے کیا؟ بعد میں اس نے جہازوں اور ریل گاڑیوں میں بھی پیسہ لگانا شروع کر دیا۔

اپنی اتنی دولت کے باوجود وہ ایک پیسہ بھی فالتو خرچ نہیں کرتا تھا اور بڑے حساب سے گزر بسر کرتا تھا۔ مثلاً جب وہ مرض الموت کا شکار تھا تو اس کے ڈاکٹر نے شیمپئن کا مشورہ دیا۔

اس پر وہ چلا کر اس سے کہنے لگا۔

”کیا کہا؟ شیمپئن؟ مجھ میں شیمپئن پینے کی طاقت کہاں ہے، کیا سوڈا واٹر سے کام نہیں چلے گا؟“

شادی کے بعد جب وہ زندگی میں قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس زمانے میں اس کی بیوی ایک ہوٹل چلایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے گیارہ بچوں کی دیکھ بھال بھی کیا کرتی تھی۔ وہ خواب دیکھتی تھی کہ کب ان کے پاس دولت ہوگی اور اسے ہوٹل کے جھمیلے سے نجات ملے گی اور وہ آرام دہ زندگی گزارے گی۔

لیکن جب اس کے شوہر کا شمار دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں ہونے لگا تو وہ اکثر کہتی کہ اس کے زندگی کے اچھے دن وہی تھے جب وہ ہوٹل چلایا کرتی تھی اور کنبے کو پالنے

کے لئے اسے مشکلات برداشت کرنا پڑتی تھیں۔

جب بوڑھا کارنیلس امیر ہو گیا تو اس نے شہر میں منتقل ہونے کی خواہش کی لیکن اس کی بیوی قدامت پسند تھی اور اپنی جگہ کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس بات پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔

بوڑھا اپنی بیوی کو پاگل کہا کرتا تھا اور یہ بات سچ کرنے کے لئے اس نے اسے ایک سال تک پاگل خانے بھیجے رکھا۔

اس کا خیال تھا کہ اس کا بڑا لڑکا بلی بالکل ناکارہ آدمی تھا اور کسی بھی کاروبار کے قابل نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بلی کو ایک مدت تک فارم پر ہی رکھا حتیٰ کہ وہ چالیس سال کا ہو گیا۔

پھر بلی نے اپنی ہوشیاری اور چابکدستی دکھانا شروع کر دی۔ وہ تجارت میں پر پرزے نکالنے لگا۔ اس پر بوڑھا کارنیلس بہت خوش ہوا اور اپنے کاروبار کا ایک حصہ اسے دے دیا۔ جب کارنیلس مرا تو اپنے پیچھے ایک کروڑ اسی لاکھ پونڈ کی جائداد چھوڑ گیا۔ لیکن جب اس کا بیٹا بلی فوت ہوا تو اس نے چار کروڑ پونڈ کی جائداد چھوڑی۔

بوڑھے کارنیلس میں بہت سی باتیں عجیب وغریب تھیں۔ مثلاً اس نے کبھی چیک بک استعمال نہیں کی تھی۔ وہ اپنے چیک ہمیشہ سادے کاغذ پر لکھا کرتا تھا۔ اسے دوسروں کی خیال آرائی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ چوراسی سال کا تھا اور بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا تو اس وقت بھی وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ جب نرسوں اور ڈاکٹروں نے اس سے اپنی بات منوانے کی کوشش کی تو وہ ان پر گرم پانی کی بوتلیں پھینکنے لگا۔ اس کی موت سے کئی سال قبل اخباروں کے رپورٹر اس کے مکان کے سامنے جمع رہنے لگے۔ وہ اس کے مرنے کے منتظر تھے۔

اس بات نے اسے بڑا مشتعل کیا۔ ایک دن جب ایک رپورٹر نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو وہ رینگتا ہوا اپنے بستر سے اٹھا اور زینے کے پاس جا کر زور سے چلایا۔

”ابھی میں مرا نہیں اور نہ ہی میرا مرنے کا کوئی ارادہ ہے۔“

جب وہ بیمار تھا تو اپنی مرحوم ماں کی روح سے باتیں کرنے کیلئے ماہرینِ روحانیات

کو بلایا۔ اس کی ماں کی روح نے اسے بتایا کہ وہ اپنی کمر پر پلستر لگوا لے، ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی کمر پر پلستر لگوا کر رہا۔

اپنے بے شمار دولت کی وجہ سے وہ امریکہ کے امیر ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ کسی سے نہ ڈرتا تھا، اس کے باوجود اس نے اپنی چارپائی کے پایوں کے نیچے نمکین پانی سے بھری ہوئی پلیٹیں رکھی ہوئی تھیں کہ کہیں سوتے میں روحیں اس پر حملہ نہ کر دیں۔

حکمران

پرنس روڈلف

بھرے گھر میں اسے قتل کر دیا گیا، اس کے
قاتل کا سراغ آج تک نہیں مل سکا۔

جنوری 1889ء کی ایک یخ بستہ کہر آلود صبح سورج طلوع ہونے سے قبل شہزادہ روڈلف کے کمرے سے پستول کی تین گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ شہزادہ روڈلف جو آسٹریا اور ہنگری کی مشترکہ سلطنت کا ہونے والا بادشاہ تھا۔

روڈلف کے گھر میں جو دوست سوئے ہوئے تھے۔ بجلی کی طرح اپنے بستروں سے باہر نکلے اور شہزادے کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ کوئی جواب نہ پا کر انہوں نے دروازے کی چولیں اکھاڑیں اور کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرے میں داخل ہو کر انہوں نے جو نظارہ دیکھا، اس نے ان کے اعصاب پر ایک رعشہ طاری کر دیا۔ کمرے کی ہر شے بکھری پڑی تھی۔ کرسیاں اوندھی پڑی ہوئی تھیں۔ اور شراب کی خالی بوتلیں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔ پلنگ کے تکیوں پر خون کے سرخ دھبے تھے۔ شہزادہ روڈلف اپنے شکاری لباس میں ملبوس بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بوٹ بھی نہ اتارے تھے۔ اس کے سر کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اس کے پہلو میں اس عورت کا برہنہ جسم پڑا ہوا تھا جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ اسے اس کی کنپٹی میں گولی مار کر مارا گیا تھا۔ لیکن اس کا زخم اس کے خوبصورت بالوں سے ڈھکا ہوا تھا جنہیں روڈلف اکثر چومتا تھا۔ اس کے جسم پر اور کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ ایک یونانی دیوی کی مانند خوبصورت تھی

اور موت کی آغوش میں بھی اتنی ہی حسین نظر آ رہی تھی جتنی کہ وہ زندگی میں ہوا کرتی تھی۔

یہ المیہ آج سے تقریباً سو سال قبل آسٹریا کے ایک دور دراز علاقے میں پیش آیا۔ لیکن یہ قتل یا خودکشی آج بھی آپ کی زندگی پر اثر انداز ہے۔ اور دنیا کی تاریخ پر اس کا گہرا اثر ہے۔

اس کی وضاحت بڑی سیدھی سادی ہے۔

اگر ڈیموکریٹک شہزادہ روڈلف زندہ رہتا تو ممکن ہے کہ وہ 1914ء میں جرمنی کے قیصر کو پہلی جنگ عظیم میں فوجی امداد دینے سے انکار کر دیتا۔ کیونکہ اسے قیصر سے بڑی نفرت تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شہزادہ روڈلف انگلینڈ کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیتا۔ کیونکہ اسے انگلینڈ سے محبت تھی۔ اسی طرح پہلی جنگ عظیم اور بعد میں دوسری جنگ عظیم کی آگ نہ بھڑکتی۔

کیا روڈلف نے اپنی محبوبہ کو ہلاک کر کے خودکشی کی تھی یا کسی تیسرے شخص نے ان دونوں کو مارا تھا؟ یہ راز کوئی نہیں جانتا۔ اس پراسرار حادثے سے متعلق لوگوں نے بیسیوں کتب لکھیں۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ بھید کبھی نہ کھل سکے۔

جب یہ واقعہ رونما ہوا تو اس وقت شہزادے کے ملحقہ کمرے میں اس کے صرف دو دوست تھے۔ وہ لوگ شکار کھیلنے کے لئے آسٹریلیا کے ایک دور دراز علاقے میں گئے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے خیال میں شہزادے نے خودکشی کی تھی، وہ جانتے تھے (اور اسی طرح ویانا کا آدمی جانتا تھا) کہ شہزادے کی ازدواجی زندگی بڑی تلخ تھی۔

آٹھ سال قبل اس نے سنہری بالوں والی شہزادی سٹیفنی سے شادی کی تھی جو بلجیم کے بادشاہ کی بیٹی تھی۔ لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں تھی۔ ان کی شادی بعض سیاسی وجوہات کی بناء پر ہوئی تھی۔ کئی سال سے ان کے تعلقات کشیدگی کا شکار تھے۔ شہزادی کبھی کبھار ہی اپنے شوہر کے کمرے میں جاتی تھی۔ اس کے باوجود جب شہزادہ دوسری عورتوں کو اپنے لطف و کرم سے نوازتا تو اس کی بیوی بری طرح سے حسد کی آگ میں جلنے لگتی۔

روڈلف نے دنیا بھر کی سیاحت کی تھی۔ وہ دس زبانیں بولنے پر قادر تھا۔ اس نے

کئی کتب بھی لکھی تھیں اور وہ لوگوں میں خاصا مقبول بھی تھا۔ درحقیقت وہ آسٹریا کے دارلحکومت ویانا کی آنکھ کا تارا تھا۔

1888ء میں یعنی اپنی موت سے ایک سال قبل اس کی ملاقات بیرونس ماری وتیسرا نامی ایک بڑی مسحور کن اور پرکشش لڑکی سے ہوئی جس کی رگوں میں قدیم یونانیوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ وہ انیس سال کی تھی۔ شہزادے کی عمر اس وقت انتیس سال تھی۔ دونوں والہانہ طور پر ایک دوسرے کے شیدائی بن گئے۔

یہ معاشقہ جنگل کی آگ کی طرح سارے ویانا میں پھیل گیا اور جہاں بھی چار لوگ مل بیٹھتے اس کا ذکر کیا جاتا، اڑتے اڑتے یہ خبر بوڑھے بادشاہ فرانز جوزف تک بھی جا پہنچی۔ پہلے تو اس نے اس خبر پر کوئی توجہ نہ دی۔ مگر یہ معاشقہ طویل ہوتا چلا گیا تو صورت حال کچھ بدترین صورت اختیار کرنے لگی۔ اب بچے بچے کی زبان پر یہ داستان محبت تھی۔ اس لئے فرانز جوزف نے بیٹے کو محل میں بلایا اور اسے یہ ناجائز معاشقہ ختم کرنے کی نصیحت کی۔

لیکن روڈلف نے بوڑھے بادشاہ کا حکم نہ مانا اور قسم کھائی کہ وہ ماری کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔ اس پر فرانز جوزف مشتعل ہوا اور اس نے اپنے بیٹے کو ڈرایا دھمکایا۔ لیکن یہ سب دھمکیاں بے کار گئیں۔ روڈلف اپنی بات پر اڑا رہا اور اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ماری کے لئے تاج وتخت سے بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار ہے اور یہی حقیقت بھی تھی۔
روڈلف نے اس بات کا ارادہ کرلیا تھا کہ وہ تخت سے دستبردار ہوجائے گا اور اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر ماری سے شادی کرلے گا، اس پر بادشاہ نے اسے اور لعنت ملامت سے نوازا۔

اس واقعہ کے بعد روڈلف اور ماری دنیا سے چھپ چھپا کر اس مکان میں ملتے رہے جہاں بعد میں وہ دونوں قتل ہوئے۔ جنوری کے ایک ہفتے کو وہ چند خوشگوار دن گزارنے کی خاطر وہاں گئے تھے کہ وہاں یہ حادثہ رونما ہوگیا۔ اچانک پستول کے تین فائر سنائی دیے اور تاریخ کا دھارا بدل گیا۔
اس حادثے سے ایک صبح قبل روڈلف کو اس کے خدمتگار خاص نے نیند سے

بیدار کیا کیونکہ اس صبح کو اس نے شکار کھیلنے کے لئے جانا تھا۔ لیکن اس کے ملازم نے اسے آگاہ کیا کہ مطلع ابر آلود ہے اور موسم بھی بڑا سرد ہے۔ اس لئے روڈلف نے اس دن شکار کھیلنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اس نے اپنی گاڑی منگوا کر ویانا واپس جانے کی خواہش کی۔
وہ خدمت گار ہی آخری شخص تھا جس نے روڈلف اور اس کی بیوی کو زندہ دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس صبح کو شہزادہ بڑا خوش تھا۔ جب بھی اس سے پوچھا گیا تو اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ روڈلف اور ماری نے خودکشی نہیں کی بلکہ انہیں قتل کیا گیا ہے۔
اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر روڈلف کو خودکشی کرنے کی ایسی کونسی ضرورت پڑ گئی تھی۔ دنیا میں بہت کم لوگوں کو اس جیسی آسائشات حاصل تھیں، بے تحاشا دولت، عوام میں حد سے زیادہ مقبولیت، جوانی، محبت اور تخت، آخر اس کے پاس کیا نہیں تھا۔
بوڑھے بادشاہ نے اس معاملے پر پردہ ڈالنے کے لئے شاہی ڈاکٹر سے یہ بیان دینے کو کہا کہ شہزادے کی موت مرگی سے ہوئی ہے۔ لیکن شاہی ڈاکٹر نے صاف انکار کر دیا۔

روڈلف کو شاہی شان وشوکت سے شاہی قبرستان میں اُن افراد کے ساتھ دفنایا گیا جنہوں نے آسٹریا پر چھ صدیوں تک حکومت کی تھی، لیکن اس کی محبوبہ کی لاش کو ایک بڑے ٹوکرے میں اسی مکان کے کمرے میں رکھ دیا گیا جہاں وہ چند روز کسمپرسی سے پڑی رہی۔ آخر چند دنوں کے بعد اس کو دیودار کے درختوں کے ایک گھنے جنگل میں دفن کر دیا گیا۔ وہ ہیٹ جسے پہنے وہ بڑی خوشی خوشی اپنے محبوب سے ملنے آیا کرتی تھی، تکئے کے طور پر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا گیا۔
صرف دیودار کے درختوں سے گزرنے والی ماتمی ہوا نے اس کا نوحہ پڑھا۔

قلوپطرہ

دنیا کی حسین ترین اور دور اندیش عورت اس نے انتالیس برس کی عمر میں خودکشی کر لی دنیا کے دو عظیم ترین شخص اس کے دام محبت میں گرفتار رہے۔

یہ اس حسین ترین عورت کی زندگی کی داستان کا ایک حصہ ہے جسے دیکھتے ہی مردوں کے خون کی گردش تیز ہو جایا کرتی ہے، اس کا نام قلوپطرہ تھا۔ وہ سرزمین مصر کی دیوی صفت ملکہ تھی، قلوپطرہ، نیل کی جادوگرنی۔

اسے مرے ہوئے دو ہزار سال ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کی شہرت صدیوں کی حدود وقیود سے آزاد چڑھتے ہوئے سورج کی مانند بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے انتالیس سال کی عمر میں خودکشی کر لی تھی۔ لیکن اس مختصر سی زندگی میں اس نے دنیا کے دو عظیم ترین انسانوں کو اپنی محبت کے جادو میں گرفتار کر لیا تھا۔ ان کے نام تھے انطونی اور جولیس سیزر۔ مؤخر الذکر کا احترام آپ اتنی ہی مرتبہ کریں گے جتنی مرتبہ آپ جولائی کے مہینے کا نام لیں گے۔ کیونکہ اس مہینے کا نام اس کی یاد میں رکھا گیا ہے۔

سیزر نے عملاً پوری دنیا فتح کر لی تھی۔ لیکن چھوٹی موئی قلوپطرہ نے اسے فتح کیا اور یہ اس نے کیسے کیا، یہ کہانی تاریخ میں ایک ڈرامائی حیثیت رکھتی ہے۔

حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے اڑتالیس سال قبل جب جولیس سیزر کا

جنگی بیڑا اسکندریہ کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو اس زمانے میں قلوپطرہ کی بڑی خراب حالت ہوا کرتی تھی۔ اس کا تخت اس سے چھن چکا تھا اور وہ پائی پائی کی محتاج تھی ہر وقت اسے اپنے قتل کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی سے شادی کر لی تھی۔ لیکن ان دونوں میں خانگی جھگڑے بے حد طوالت اختیار کر چکے تھے۔ اس کے بھائی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے قاہرہ سے بھاگ گئی تھی۔ سیزر نے اسے اپنے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا۔ لیکن وہ اس کے سامنے کیسے آتی؟ یہ ایک مسئلہ تھا کیونکہ سکندریہ اس کے بھائی کے جاسوسوں سے بھرا پڑا تھا۔ اگر وہ پکڑی جاتی تو اس کا مطلب موت تھا۔ آخر کار ایک اندھیری رات کو وہ اپنے ملازم کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے کی ایک کشتی میں بیٹھ کر سکندریہ میں داخل ہوئی۔ اس کے ملازم نے اس کو ایک غالیچے میں لپیٹ رکھا تھا۔ جسے اب محل کے اندر پہنچایا جانا تھا۔ محل کے اندر پہنچ کر قلوپطرہ کے ملازم نے سیزر کی نظروں کے سامنے غالیچہ کھولا۔

جب قلوپطرہ اس کے اندر سے نکل کر مسکرانے لگی اور کمرے میں تھرکنے لگی۔ تو اس کے بلوریں اور مرمریں بدن کو دیکھتے ہی حیرت زدہ سیزر کے خون کی گردش بڑھ گئی۔ ایسا جادوئی منظر اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بدبدانے لگا۔ ''ایسی حسینائیں روم میں کیوں نہیں ہیں؟''

سیزر کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ اس کا سر گنجا ہو چکا تھا۔ قلوپطرہ اس وقت عمر کے اکیسویں سال میں تھی۔ قلوپطرہ کو دیکھتے ہی سیزر کو ایسا لگا کہ جیسے کوئی طوفانی لہر اسے اٹھا کر محبت کے دھند زدہ جزیروں پر چھوڑ آئی ہو۔ اس کی ذہانت اور جذبات کی اشتعال انگیزی نے سیزر کو زندگی بھر کے لئے قلوپطرہ کا غلام بے دام بنا دیا۔

اس کا بھائی اس کی ہلاکت کا متمنی تھا۔ سیزر نے قسم کھائی کہ وہ اس نوجوان کو ایک ایسا سبق سکھائے گا کہ جو اس کو عمر بھر یاد رہے گا۔ اس نے بہادر رومی سپاہیوں کو مصری فوج پر حملہ کرنے کا حکم دیا اور قلوپطرہ کے بھائی کا تعاقب دریائے نیل تک کیا۔ جہاں وہ ڈوب کر مر گیا۔

اس کے بعد قلوپطرہ بلا روک ٹوک مصر کی ملکہ بن گئی اور فرعون کی سرزمین پر اس کا

قبضہ ہوگیا۔

کئی ماہ بیت گئے ۔سیزر کا قلوپطرہ سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ سیزر کی ایک بیوی روم میں بھی تھی۔اس لئے وہ مروجہ قانون کی وجہ سے قلوپطرہ سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ لوگ اس کے خلاف باتیں کریں گے۔اس لئے لوگوں کی زبان کو لگام دینے اور اپنے بیٹے کو سیزر کا جائز وارث بنانے کے لئے قلوپطرہ نے ایک بہت ہی شاندار سی چال چلی۔اس نے پادریوں کو حکم دیا کہ وہ سیزر کو ایک انسان کی بجائے دیوتا قرار دیں۔اب وہ سورج کے دیوتا امون کا اوتار تھا اور سیزر کے بھیس میں ان کی ملکہ کو ایک بیٹا دینے کے لئے آیا تھا۔

حالانکہ آج یہ کہانی بہت ہی عجیب سی لگتی ہے لیکن آج سے دو ہزار سال قبل لوگوں نے اس پر یقین کرلیا تھا۔ اگر قلوپطرہ ہمارے زمانے میں ہوتی تو اسے اس داستان گوئی کی سزا بھگتنی پڑتی۔

اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سیزر قتل ہوگیا اور شرابی اور مقروض انطونی روم کا سب سے طاقتور انسان بن گیا۔اپنی فتح کے نشے میں چور اس نے مشرق پر حملہ کیا اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیا اور خود بھی ایک غیر اخلاقی زندگی بسر کرنے لگا، اس وقت مصر مشرق کا امیر ترین ملک تھا۔اس لئے انطونی کے بعض عقیدت مندوں نے اس سے کہا، آیئے سکندریہ چل کر قلوپطرہ کا سراڑا کر مصر میں عیش وعشرت کا بازار گرم کریں۔

یہ خبر سن کر قلوپطرہ کانپ گئی۔ وہ انطونی کو کیسے روکے؟ جنگ و جدل سے نہیں، پیار و محبت سے، ہاں یہ طریقہ کامیاب رہے گا۔اس کے گرد ایک الف لیلوی ماحول تھا۔اس نے اپنی نشست کے آس پاس محبت کے دیوتا کیوپڈ کی علامت کے طور پر کئی خوبصورت لڑکوں کی تصویریں بنوائی تھیں جو اسے مورچھل سے پنکھا جھل رہے تھے۔آس پاس کئی جذبات انگیز خادمائیں تھیں جنہوں نے ریشمی ملبوسات پہن رکھے تھے۔وہ صحرائی موسیقی کی لہروں پر ناچ رہی تھیں۔طرح طرح کی خوشبوؤں اور صندل اور لوبان کے جلنے سے ماحول نشیلا بنا ہوا تھا۔اس سارے طلسمی ماحول میں قلوپطرہ بذات خود ایک ابریشمی صوفے پر محبت کی دیوی وینس کا روپ دھار کر بیٹھی ہوئی تھی۔

اب اگر آپ مارک انطونی ہوتے تو خود ہی بتایئے کہ آپ کیا کرتے؟ انطونی اس ساری فسوں کاری کے آگے بے بس ہوگیا۔اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش ہی نہ کی۔

انطونی ایک بڑا سخت، اکھڑ اور بدتہذیب آدمی تھا جو عورتوں کے اجتماع میں بڑا خوش رہتا تھا اور بعض اوقات اپنے ملک کو بھی بدنام کرنے سے گریز نہ کرتا۔اور اب قلوپطرہ جو کہ ایک عظیم نسل سے تعلق رکھتی تھی۔نہایت مہذب اور شائستہ خاتون تھی اور شعروں میں بات کیا کرتی تھی، اس کی بیوی بن گئی۔وہ بے طرح اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔جس سے اس کی ہنگامہ خیز اور وحشت بھری زندگی میں ایک سکون سا آ گیا۔وہ اپنی بیوی کا اتنا دیوانہ ہوا کہ گزشتہ دو ہزار سالوں میں انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

قلوپطرہ مردوں کو قابو کرنا جانتی تھی۔اس نے انطونی کے انداز واطوار کی پرواہ نہ کی۔وہ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق کرتی تھی، وہ اس کے ساتھ شمشیر زنی کرتی اور شکار کھیلنے جایا کرتی تھی۔بعض اوقات وہ ایک غلام کا بھیس بدل کر اس کے ساتھ رات کے وقت گلیوں میں گھومتی پھرتی۔ایک بار وہ دریائے نیل میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے، انطونی کے ہاتھ کوئی مچھلی نہ لگ رہی تھی۔اس نے قلوپطرہ سے اس کی شکایت کی۔قلوپطرہ نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ چوری سے ایک مچھلی لے کر جہاز کے عقب سے ہو کر دریا میں اتر جائے اور پانی کے اندر غوطہ لگا کر وہ مچھلی انطونی کے کانٹے کے اندر پھنسا دے۔

قلوپطرہ اس کا بڑا خیال رکھتی تھی اور اس کے لئے قسم قسم کے کھانے تیار کیا کرتی تا کہ جس وقت انطونی کو کھانے کی خواہش ہو تو اسے جو چاہے مل جائے۔قلوپطرہ کی اس خدمت گزاری اور وفا شعاری پر انطونی اس کا اتنا گرویدہ ہوگیا تھا کہ ہوش وحواس بھی کھو بیٹھا تھا۔اس نے تحفے کے طور پر اپنے مفتوحہ علاقے قلوپطرہ کو دے دیئے تھے۔ان میں قبرص کا جزیرہ بھی شامل تھا۔اس کی دریا دلی کا نقطہ عروج یہ تھا کہ اس نے سارے کا سارا ایشیا قلوپطرہ کو دے دیا تھا۔

ان تحائف کی خبر جب روم میں پہنچی تو وہاں کے لوگ نفرت اور غصے سے کھولنے لگے۔سینکڑوں لڑائیوں بھڑائیوں کے بعد اہل روم کے قیمتی خون سے حاصل کئے جانے والے یہ علاقے ایک مصری حسینہ کی عشوہ طرازیوں پر اس طرح نچھاور کر دیئے جائیں گے؟

اس کا جواب جنگ تھا۔ قلوپطرہ کے دن بیت چکے تھے۔ وہ اپنا کھیل کھیل چکی تھی۔ روم غصے سے مشتعل ہو گیا۔ اس نے قلوپطرہ اور انطونی کی فوجوں کو شکست دے کر ان کے جہاز بھی نیست و نابود کر دیئے۔

وہ اپنے انجام سے باخبر تھے۔ انطونی کو پتہ تھا کہ اگر وہ زندہ گرفتار ہو گیا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اس لئے اس نے اپنے سینے میں چھرا گھونپ لیا اور گر کر اس سے چمٹ گیا۔

قلوپطرہ نے قسم کھائی کہ وہ کبھی گرفتار نہیں ہو گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر اسے روم میں گھمایا جائے اور لوگ اس پر آوازیں لگائیں۔ اس لئے اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی، اس نے کس طرح یہ خودکشی کی، یہ راز کبھی کوئی نہ کھول سکے گا۔ وہ لوگ بھی اس سربستہ راز کو کھولنے میں ناکام رہے تھے جو اس کی موت کے بیس منٹ کے بعد ہی اس کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ اکثر یہ کہتے ہیں کہ پہلے اس نے دانتوں سے اپنے بازو پر کاٹا تھا اور پھر زخموں میں زہر ڈال لیا تھا۔ اکثر یہ کہتے ہیں کہ اس نے پھولوں کی ٹوکری میں ایک سانپ ڈلوا کر اپنے کمرے میں منگوایا تھا اور جب دشمن کی فوجیں اس کے محل کا دروازہ توڑ رہی تھیں تو اس نے اس سانپ سے اپنی چھاتی پر ڈسوا لیا تھا۔

آج وہ مصر ہی میں کہیں مارک انطونی کے پہلو میں دفن پڑی ہوئی ہے وہ کون سی جگہ ہے، یہ بھی ایک سربستہ راز ہے۔ اگر آپ اسکندریہ جا کر اس کی قبر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آپ بڑے دولتمند ہو سکتے ہیں اور دنیا بھر کے اخبارات میں آپ کا نام جلی حروف میں شائع ہو گا۔

کیتھرین

وہ دنیا کے سب سے بڑے ملک کی ملکہ تھی وہ
اپنے عاشق کی فہرست میں اضافہ کر کے بے
حد خوشی ہوتی۔

روس کے شاندار تخت پر جتنے بادشاہ جلوہ افروز ہوئے ہیں ان میں سے عظیم ترین ملکہ کیتھرین تھی۔

لیکن اس کا حقیقی نام کیتھرین نہیں تھا اور نہ ہی وہ روسی تھی۔ بعض مؤرخین تو اسے عظیم ماننے سے بھی انکاری ہیں۔

جب وہ روس میں آئی تھی تو کچھ بھی نہ تھی، وہ افلاس کی ماری ہوئی ایک جرمن شہزادی تھی جسے ہر کوئی راستے کا پتھر سمجھ کر ٹھوکر مار دیتا تھا۔ جب وہ روس میں پہنچی تو بالکل بے یار و مددگار تھی۔ اس کے باوجود وہ روس کے تخت کے وارث شہزادے ڈیوک پیٹر سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ لیکن جہاں تک پیٹر کا تعلق ہے، وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ پرلے درجے کا احمق تھا۔ اس کا چہرہ چیچک زدہ تھا اور چیچک اور پھنسیوں کے داغوں نے اس کے چہرے کو گھیر رکھا تھا وہ جوتوں سمیت ہی بستر میں گھس جایا کرتا تھا۔ زار روس بننے کے بعد بھی وہ اپنے معمولی ملازمین کے ہمراہ شراب پینے سے باز نہیں آیا تھا۔ وہ چھڑی لے کر خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سپاہیوں کو مارا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات فرش پر دراز پہروں موم کی گڑیوں سے کھیلا کرتا، ان گڑیوں کو اس نے سپاہیوں کی وردی پہنائی ہوئی تھی۔

کیتھرین کے بچے بھی تھے لیکن اس کا احمق شوہر انہیں اپنے بچے تسلیم نہیں کرتا تھا۔ وہ صاف طور پر کہہ دیا کرتا تھا کہ وہ بچے اس کے نہیں تھے۔

وہ سینکڑوں مہمانوں کے روبرو کیتھرین کی بے عزتی کیا کرتا تھا۔۔ وہ اسے ایسی فحش گالیاں دیا کرتا تھا کہ انہیں دہرانے کی میں اپنے اندر ہمت نہیں پاتا ہوں۔ وہ اسے طلاق دینے کی دھمکی دیا کرتا تھا۔ اور یہ بھی کہا کرتا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر کے لئے کال کوٹھری میں بند کر دے گا۔

وہ کیتھرین سے بے حد نفرت کرتا تھا اور کیتھرین بھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنے شوہر کے خلاف بغاوت کر دی، اسے تخت سے معزول کر دیا اور اپنے ایک عاشق کی مدد سے اس کی شراب میں زہر ملا دیا۔

لیکن پیٹر اتنا سخت جان تھا کہ زہر بھی اس پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔ اس لئے کیتھرین کے عاشق نے اسے لات مار کر زمین پر گرا دیا اور اس کے گلے میں رومال باندھ کر اسے اس وقت تک بل دیتا گیا جب تک کہ پیٹر کی جان نہ نکل گئی۔

تب اس واقعے کے اکتیس سال کے بعد تک کیتھرین روئے زمین کی عظیم سلطنت پر حکومت کرتی رہی، وہ ایک ایسی سرزمین پر حکمران رہی جس میں پچاس مختلف نسلیں آباد تھیں، اس کے باوجود وہ روس کو اپنا چھوٹا گھر کہا کرتی تھی۔ اس نے پھر کبھی شادی نہ کی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تنہا رہی تھی۔ اس کے رومان بھرے گرم و گداز دل کی رقص گاہ میں سینکڑوں عاشق رقص کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے پوتوں کے ساتھ اس قدر سختی کیا کرتی کہ اس نے انہیں نباتات کی تعلیم حاصل کرنے سے بھی منع کر دیا تھا کیونکہ وہ اس سے یہ پوچھا کرتے تھے کہ پودے کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔

وہ اپنے عاشقوں اور مداحوں کی خوب مدد کیا کرتی اور ان پر لاکھوں روپے خرچ کیا کرتی۔ اگرچہ ان میں سے کئی بڑے نااہل تھے لیکن اس نے انہیں روس کی فوج میں جرنیل بنا رکھا تھا۔ اس نے پولینڈ کو فتح کیا اور اپنے ایک عاشق کو وہاں کا حکمران بنا دیا۔ وہ پولینڈ کا حکمران بننے کا خواہشمند نہیں تھا۔ لیکن کیتھرین اس سے اس قدر تنگ آ چکی تھی کہ وہ اس سے پیچھا چھڑانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس لئے اس نے اس کو ایک طرح سے پولینڈ

میں ملک بدر کر دیا تھا۔ بعد میں کیتھرین اسے تباہ کر کے اس کا طلائی تخت روس میں لے آئی۔ وہ تخت اس نے اپنے غسل خانے میں رکھوا دیا تھا اور اس پر بیٹھ کر غسل کیا کرتی۔

اس کے ایک خاص منظور نظر کا نام گریگری اورلوف تھا۔ وہ ایک فوجی آفیسر تھا اور بڑا خوبصورت تھا۔ اس کا جسم یونانی دیوتاؤں جیسا تھا۔ وہ ملکہ کو اپنے مکوں سے مار مار کر لال پیلا کر دیا کرتا تھا۔ تب وہ اس سے تنگ آ کر ہفتوں اسے اپنی شکل نہ دکھایا کرتا اور محل کی ہر حسین خادمہ کو چومتا پھرتا، لیکن اگر کیتھرین فراخ دل نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتی۔ وہ ہر بار خوبصورت اورلوف کو معاف کر دیا کرتی تھی اور خطابوں اور دولت سے مالا مال کر دیا کرتی۔ آخر کار وہ ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ بھاگ گیا اور بعد میں پاگل ہو گیا۔

تب عظیم کیتھرین کو ایک بدصورت دیوآسا مرد سے عشق ہو گیا۔ اس کا نام پوتمکن تھا۔ پوتمکن کی صرف ایک آنکھ تھی، جبکہ اس کی دوسری آنکھ ایک جنگ کی نظر ہو گئی تھی۔ حالانکہ پوتمکن ایک ایسے محل میں رہتا تھا جہاں دنیا کی ہر خوبصورت چیز موجود تھی مگر وہ پاؤں میں محض سلیپر پہنے محل میں پھرتا رہتا تھا۔ اس کے کھردرے بال ہمیشہ بکھرے رہتے تھے۔ غسل سے اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ وہ اپنی انگلیوں کے ناخن چوستا رہتا تھا۔ وہ خام پیاز اور لہسن بڑی رغبت سے کھایا کرتا تھا۔ لیکن پوتمکن طاقت کا پہاڑ تھا اور اس کا صرف ایک لمس ہی کیتھرین کو مسرت سے ہمکنار کر دیا کرتا تھا۔ وہ اسے پیار سے سنہری تیتر اور کبوتر کہتی۔

اس کا کبوتر روس کے عظیم ترین جرنیلوں میں سے تھا۔ اس کے باوجود وہ توپوں کی گھن گرج سے بڑا خائف ہوتا تھا اور جب کوئی توپ چلتی تھی تو وہ کسی لڑکی کی طرح کانپ اٹھتا تھا۔

اگرچہ کیتھرین دنیا کی امیر ترین عورت تھی لیکن وہ دن میں محض دو بار ہی کھانا کھایا کرتی تھی۔ اور اس کی غذا بھی بڑی سادہ ہوا کرتی۔ اس سے اچھی غذا تو ایک اوسط درجے کی آمدنی والا شخص کھاتا ہے۔ لیکن اس کا کھانا سونے کی پلیٹوں میں آیا کرتا تھا۔ اگر کبھی خانساماں سے گوشت جل جایا کرتا تو وہ قہقہہ لگاتی اور اسے اسی طرح کھا جایا کرتی۔

حالانکہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ عاشق مزاج عورت تھی لیکن اس نے کبھی شراب کا ایک قطرہ بھی حلق سے نیچے نہ اتارا تھا۔ وہ پھلوں کا رس بڑے شوق سے پیتی تھی۔ اس کے

علاوہ وہ ہر صبح کافی کی پانچ پیالیاں پیتی۔ یہ پانچ پیالیاں تیار کرنے کے لئے ایک پاؤنڈ کافی استعمال کی جاتی تھی۔

اس کے ارد گرد سینکڑوں غلام ہوتے، اس کے باوجود وہ اپنی آگ خود جلاتی تھی۔
اس نے اپنی زندگی میں کبھی تمباکو نہیں پیا تھا، لیکن وہ نسوار خوب چڑھایا کرتی تھی۔ یہ نسوار بالعموم اس کے لباس پر بکھری پائی جاتی تھی، حد تو یہ تھی کہ نسوار کی بُو اس کے لباس میں بھی رچی ہوتی تھی۔

وہ بہت دراز قد تھی اور خود کو مزید دراز قد بنانے کے لئے گردن لمبی کر کے چلتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ بچپن میں ایک بیماری کی وجہ سے اس کی کمر ٹیڑھی ہو گئی تھی اور اسے سیدھا کرنے کی خاطر اسے مہینوں ایک آہنی جیکٹ پہننی پڑی تھی۔
اس کے سر کی کھوپڑی اتنی مختصر تھی کہ کسی چھ سال کے بچے جیسی معلوم ہوتی تھی۔
چھبیس سال کی عمر میں اس کی کھوپڑی بڑھنا شروع ہوئی اور وہ بھی قسم قسم کی جراحی کے بعد۔
اسے سر درد کے شدید دورے پڑتے تھے۔

وہ بڑی ضدی اور انا پسند تھی اور کسی ایسے خط کو ہرگز نہیں کھولتی تھی جس پر ''ہر امپیریل میجسٹی'' نہ لکھا ہوتا۔ ایک بار اس نے ایک شخص کا ناک کاٹ دیا تھا کیونکہ وہ شراب کے نشے میں خود کو اس کا شوہر کہنے لگا تھا۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ کیتھرین موٹی ہوتی گئی۔ اتنی موٹی کہ اس کے پاؤں اس کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہو گئے۔ پھر اسے پہیوں والی کرسی استعمال کرنا پڑی تھی۔
اگرچہ وہ بڑی موٹی اور بڈھی کھوسٹ ہو چکی تھی لیکن پھر بھی جب بھی بہار آتی تو اس کے دل میں محبت کے سوئے جذبات جاگ پڑتے اس عمر میں وہ ایک بار پھر محبت کا شکار ہو گئی۔ لیکن اس بار اس کا محبوب ایک ایسا لڑکا تھا جو اس کے پوتے کی عمر کا ہو گا۔ اپنی عمر کے آخری سالوں میں اس انا پسند، مغرور اور ضدی خاتون نے واقعی ایک زار کی طرح حکومت کی تھی۔ وہ عظیم ہو نہ ہو، لیکن زبردست ضرور تھی۔

گرینڈ ڈچز ماری

زندگی میں اس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ ریشمی جرابیں پہنے، یہی خواہش پوری کرنے کے لئے اس نے شادی کی۔

کچھ عرصہ قبل مجھے روس کی ایک شہزادی کے ہاں مہمان بن کر جانے کا اتفاق ہوا، اس کا نام گرینڈ ڈچز ماری ہے۔ اس کا چچا الیگزینڈر سوم زار روس تھا اور اس کا چچا زاد بھائی نکولاس دوم روس کا آخری زار تھا۔ اس کی سہیلیاں زار روس کی بیٹیاں تھیں۔ میرے خیال میں مغرب میں گرینڈ ڈچز ماری سب سے مشہور شاہی شخصیت ہے۔
اسے ملنے سے قبل میرے ذہن میں اس سے متعلق طرح طرح کے خیالات تھے۔ وہ کس قسم کی ہو گی؟ کیا وہ خوبصورت اور پرکشش شخصیت کی حامل ہو گی؟ کیا اس کا طرز سلوک دوستانہ ہو گا؟ کیا وہ مساوات کی حامی ہو گی؟ یا پھر کہیں وہ بڑی سرد مہر اور تنہائی پسند ہو گی؟

جب میں اس سے ملا تو وہ بڑی مروت سے پیش آئی۔ میں اس کی شخصیت سے بڑا متاثر ہوا۔

اس نے مجھے اپنے بارے میں حیرت انگیز باتیں بتائیں۔ اب اس کی عمر ساٹھ سال کے اریب قریب ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ زندگی کے ابتدائی بیس سالوں میں وہ بڑی شرمیلی اور عجز پسند ہوتی تھی۔ وہ ایک شدید قسم کے احساس کمتری کا بھی شکار تھی۔

وہ ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ تھی جس نے تین سو سال تک روس پر حکومت کی تھی۔ بچپن ہی میں وہ اتنی اہم سمجھی جاتی تھی کہ شام کے وقت وہ سونے کی گاڑی میں بیٹھ کر سیر کرنے کو جایا کرتی تھی۔ اس کے چاروں طرف سپاہیوں کا کڑا پہرا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اتنی مشہور تھی کہ جب اس نے محل سے نکلنا ہوتا تھا تو لوگ اسے دیکھنے کے لئے کئی کئی گھنٹے قبل ہی بازاروں میں قطار باندھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ احساس کمتری کا شکار تھی، یقین نہیں آتا۔

اس چیز کا اس کی بچپن کی تربیت سے گہرا تعلق ہے۔ اسے ماں کی محبت کا علم ہی نہ تھا کیونکہ ابھی وہ ڈیڑھ سال کی ہی تھی تو اس کی ماں فوت ہو گئی، اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اس بار اس نے ایک ایسی عورت سے شادی کی جس کی رگیں شاہی خاندان کے خون سے محروم تھیں۔ اس جرم کی سزا میں اسے روس سے جلاوطن ہونا پڑا اور اس کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی۔ چھوٹی شہزادی کی پرورش زیادہ تر اساتذہ اور نرسوں وغیرہ نے کی۔

چھ سال کی عمر میں ابھی شہزادی کو اپنی مادری زبان کا ایک لفظ بھی بولنا نہیں آتا تھا۔ اس وقت اسے صرف انگریزی ہی سکھائی گئی تھی۔ لیکن یہ انگریزی بھی اچھی نہ تھی۔

اس کے اساتذہ نے اسے اس کے رتبے اور عظمت سے بے خبر رکھا۔ جو کہ شاہی فرد ہونے کی وجہ سے اس کا بنیادی حق ہے، اس کے علاوہ چونکہ شاہی خاندان کے پہلے بچے اپنی تربیت، لاڈ وغیرہ کی وجہ سے بڑے گستاخ اور مغرور واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ڈچز ماری کے اساتذہ کو اس بات کی بطور خاص تاکید کی گئی تھی کہ ڈچز ماری کے اندر عجز و انکسار بھرا جائے۔ سو یہ کام انہوں نے بڑی خوبی سے سر انجام دیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کی پرورش بڑے سادہ ماحول میں ہوئی تھی۔ اگر وہ روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی ضائع کر دیتی تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ وہ جہاں سے کوئی چیز اٹھاتی اسے وہیں رکھنی پڑتی۔ اس کی غذا بھی بڑی سادہ تھی۔ اکثر اوقات اسے صرف دودھ اور ڈبل روٹی کھانے کے لئے ملتے تھے۔

اس کا لباس بھی بڑا سادہ ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ اطلس اور کمخواب کے درمیان رہتی۔ مگر اسے ہمیشہ سوتی کپڑے پہننے کو ملے۔ اس کے دستانے اور جرابیں بھی سوتی ہوا

کرتی تھیں۔ شادی کے وقت تک وہ سوتی لباس پہنتی رہی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شادی کرنے کی خواہشمند اس وجہ سے بھی تھی کہ شادی کے بعد اسے ریشمی جرابیں پہننے کو مل سکیں۔

بعد ازاں وہ اپنے چچا اور چچی کے ساتھ رہنے لگی۔ اس کی چچی اس سے بڑا حسد کرتی اور گھر میں اس کی موجودگی بھی اسے گراں گزرتی، اگر وہ کھانے پر ایک منٹ بھی دیر سے آتی تو چچی اسے سزا دیتی اور پھر اگر وہ مہمانوں کے ساتھ دلچسپ گفتگو کرنے میں ناکامیاب رہتی تو اس پر بھی اس کی چچی اسے سزا دیتی۔ اس کی چچی اسے اپنی موجودگی میں کبھی ہنسنے نہ دیتی۔ بچوں کی ہنسی اس کی طبع نازک کو ناگوار گزرتی تھی۔

شہزادی نے مجھے بتایا کہ وہ حقیقی گھر کے آرام سے ہمیشہ محروم رہی ہے۔ اس کا بچپن بڑا الگ تھلگ اور مایوسی کے عالم میں گزرا، صرف اسے اپنی دادی ملکہ اولگا آف گریس سے مادری محبت ملا کرتی تھی۔ وہ مادری محبت کی اتنی بھوکی تھی کہ وہ اپنی دادی کے بازوؤں سے چمٹ جاتی تھی۔

جب وہ سولہ سال کی تھی تو اسے منڈولن (ایک ساز) بجانے کا شوق ہوا۔ لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ منڈولن خرید سکتی اور نہ اس میں اتنی ہمت تھی کہ چچا سے فرمائش کر سکے۔ وہ ڈرتی تھی کہ چچا انکار کر دے گا۔ آخر اس نے اپنے استاد کے ذریعے سے چچا کو کہلوایا۔ چچا نے ہاں کر دی۔ یہ ہاں اس کی زندگی کا آخری لفظ تھا کیونکہ اس کے چند سیکنڈ کے بعد ایک دہشت گرد نے بم پھینک کر اس کے جسم کے ٹکڑے کر ڈالے۔

نظام حیدرآباد

وہ امریکہ کے راک فیلر اور مورگان جیسے
دولتمندوں کو خرید سکتا ہے لیکن اپنی محبوب بیوی
کو فقط دوسو روپے ماہوار بطور جیب خرچ دیتا
ہے۔

دنیا کا امیر ترین آدمی انگلیوں سے کھانا کھاتا ہے۔ وہ نہ تو چاقو نہ ہی کانٹا اور نہ ہی چمچہ استعمال کرتا ہے۔

یہاں میرا اشارہ نہ مسٹر مورگان، نہ ہی مسٹر راک فیلر اور نہ ہی مسٹر فورڈ کی جانب ہے۔

دنیا کے اس امیر ترین آدمی نے کبھی سٹہ نہیں کھیلا۔ اس نے وال سٹریٹ کی شکل تک نہیں دیکھی۔ بہت سے لوگوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔

اس کا نام عثمان علی خان بہادر فتح جنگ آصف جاہ ہے۔ لیکن اسے بالعموم نظام آف حیدرآباد کہا جاتا ہے، وہ ان مغل شہنشاہوں کا جانشین ہے جو صدیاں ہوئیں درہ خیبر کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے اور یہاں پر سینکڑوں سال حکومت کرتے رہے (یہ مضمون نظام حیدرآباد کے زوال سے کافی پہلے کا ہے)

اس کی اتنی ساری دولت اس کے کس کام آتی ہے؟ مجھے تو اس کا کوئی مصرف معلوم نہیں پڑتا۔ ہاں بس ایک مصرف ہے۔ اس کا ایک حرم ہے جس میں پانچ سو کے قریب

عورتیں رہتی ہیں۔ ان عورتوں میں سے صرف ایک عورت اس کی منظور نظر ہے جو رولز رائس کار میں گھومتی ہے۔ اس کار کے اندر پردے لگے ہوئے ہیں تاکہ عوام اس کے شاہی چہرے کو نہ دیکھ سکیں۔ وہ حرم کی دوسری خوبصورت عورتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ میں نے ''خوبصورت عورتیں'' کہا تھا۔ یہ ذرا مبالغہ آرائی ہے، کیونکہ یہ حرم پچیس سال قبل نظام کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ ان میں سے بہت سی عورتیں ادھیڑ عمر یا معمر ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود نظام اتنا سخت گیر ہے کہ انہیں حرم سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا۔

دنیا کا امیر ترین آدمی ہر روز پو پھٹنے سے قبل اٹھ جاتا ہے۔ وہ گھڑی کا الارم لگا کر نہیں سوتا، اسے جگانے کے لئے موسیقار آتے ہیں جو اس کی خوابگاہ میں داخل ہو کر سازوں پر مدھم سروں میں صبح کی راگنیاں بجاتے ہیں۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ صبح سویرے اُٹھ بیٹھتا ہے اور سب سے پہلے فجر کی نماز ادا کرتا ہے۔

اس کے چار خدام ایسے ہیں جن کا صرف یہی کام ہے کہ اسے لباس پہنائیں۔ ہر خادم شاہی جسم کے مختلف حصے کو لباس پہناتا ہے۔ مثلاً ایک خادم صرف پاجامہ پہنانے کا ماہر ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں کہ شاہی قمیض کیسے پہنائی جاتی ہے۔ پاجامہ پہنانے کے بعد وہ سارا دن بیکار بیٹھا یہ انتظار کرتا رہتا ہے کہ کب دوسرا دن آئے اور وہ دوبارہ پاجامہ پہنائے۔

اگرچہ وہ ہر روز عطر سے نہاتا ہے لیکن صابن کا استعمال نہیں کرتا۔ صابن کی جگہ وہ ایک خاص قسم کا سفوف استعمال کرتا ہے۔ وہ صبح جاگنے کے چار گھنٹے کے بعد ناشتہ کرتا ہے۔

وہ نہ تو چائے اور نہ ہی کافی پیتا ہے، ان کی جگہ دودھ یا سادہ پانی پیتا ہے۔

وہ سونے کی پلیٹوں میں ناشتہ کرتا ہے جس پر طلائی کام ہوتا ہے۔ گلے میں موتیوں اور جواہرات کے ہار ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ عوام کے سامنے آتا ہے تو اس کا لباس بڑا سادہ ہوتا ہے۔

اگرچہ اس کا اپنا ایک خاص حجام ہے جس کی زندگی میں یہی ایک فرض ہے کہ وہ نظام کے بالوں کی دیکھ بھال کرے، اس کے باوجود نظام کے بال اکثر بغیر شانہ کے ہوتے ہیں اور اس کی داڑھی بڑھی ہوتی ہے۔

نظام آف حیدرآباد کے پاس سونے کی بنی ہوئی کرسیاں، سونے کی گاڑیاں اور توپیں ہیں۔ لیکن طلائی توپوں کی نزاکت کی وجہ سے وہ ان کو چلا نہیں سکتا۔ لیکن دیکھنے والے اس سے بڑے متاثر ہوتے ہیں۔

نظام نے یہ ساری دولت کہاں سے حاصل کی ہے؟ ان میں سے زیادہ تر گولکنڈہ کی وادی سے آئی ہے جو دنیا میں ہیرے جواہرات کی سب سے مشہور کان ہے۔ نظام کے تمام جواہرات اسی کان سے نکلتے ہیں۔ مشہور زمانہ کوہ نور ہیرا بھی گولکنڈہ کی وادی کی پیداوار ہے جو کہ آج کل ملکہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے۔

اتنی دولت کے باوجود بھی نظام میری اور آپ کی طرح تھوڑے بہت پیسے جمع کرنے کا خواہشمند رہتا ہے۔ مثلاً وہ بڑی بڑی شاندار دعوتیں دیتا ہے اور اپنے مہمانوں سے توقع کرتا ہے کہ وہ اس کے لئے نقدی کی صورت میں تحائف لائیں۔ بعض اوقات وہ کھانے پر پانچ سو مہمانوں کو مدعو کرتا ہے۔ اگر ہر مہمان سے پچیس روپے لئے جائیں تو بات کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

وہ خرید و فروخت کے لئے باقاعدہ طور پر بازار جاتا ہے اور ہوٹلوں سے مختلف اقسام کے کھانے چکھتا ہے۔ جب کوئی کھانا اسے پسند آ جاتا ہے تو وہ اس کی بڑی تعریف کرتا ہے، نتیجتاً ہوٹل کا مالک اس کھانے کی کافی ساری مقدار نوکروں کے ہاتھ محل میں بھجوا دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ ان کھانوں کو ٹوکروں میں بند کر کے ان پر قیمت لکھ کر اپنے قریبی دوستوں کو بھیج دیتا ہے اور ان دوستوں کو یہ شاہی تحفے قیمتاً وصول کرنا پڑتے ہیں۔

پندرہ سال قبل کا ذکر ہے کہ نظام نے اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ اس مجموعے کی عام جلد کی قیمت پچاس روپے ہوگی اور شاہی جلد کی قیمت ڈھائی سو روپے، خیال ہے کہ یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، کیونکہ حکمران شاعر کی کتاب خریدنے سے کون انکار کر سکتا ہے۔

نظام بڑی عمدہ انگریزی بولتا ہے، ہاتھی پر سے شیر کا شکار کرتا ہے، کانوں میں چھلے پہنتا ہے اور اپنی محبوب بیوی کو دو سو روپے ماہوار خرچہ دیتا ہے اور ایسے پلنگ پر سوتا ہے جس میں سپرنگ نہیں ہیں۔

نکولاس دوم

وہ دنیا کے چھٹے حصے کا مالک تھا لیکن اسے اس
کی دولت ہمراہ ایک گندے کمرے میں گولی
سے اڑا دیا گیا۔

وہ یورپ بلکہ دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں سے تھا، جب وہ مرا تو اپنے پیچھے ایک کروڑ پونڈ مالیت کی زمین اور سولہ ہزار پونڈ کے ہیرے جواہرات چھوڑ گیا۔ اس کی ماہانہ آمدن دو لاکھ پونڈ تھی یعنی پانچ پونڈ فی سیکنڈ۔

اس کے باوجود 16 جولائی 1918ء کو اسے اور اس کے کنبے کو ایک ایسے تنگ و تاریک کمرے میں بند کر کے قتل کر دیا گیا جو تعفن اور مکڑوں کے جالے سے اٹا ہوا تھا۔ اس کے اور اس کی بیوی بچوں کے قتل کی داستان تاریخ کا ایک انتہائی ڈرامائی قصہ ہے۔

اس شخص کا نام نکولاس دوم ہے۔ آخری زار روس، جو تقریباً چوتھائی صدی تک زمین کے چھٹے حصے پر بڑی آہنی گرفت سے حکومت کرتا رہا۔ تین سال تک اس کی فوجیں شاہی فرمان کے تحت بے گناہ روسی عوام کو موت کے گھاٹ اتارتی رہیں۔ آخر 1917ء میں اس کی فوجوں نے اس کے خلاف بغاوت کر دی اور انہوں نے اپنے بھائی بندوں پر ہاتھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ 14 مئی 1917ء کو آدھی رات سے کچھ قبل روسی فوج کے جرنیلوں کی ایک کمیٹی نکولاس دوم سے ملی اور اس سے کہا کہ وہ تخت سے معزول ہونے کا اعلان کرے۔

یہ غیر متوقع جملہ سن کر اسے اتنا صدمہ پہنچا کہ خوف کے مارے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر جرنیل گھبرا گئے۔ انہیں یقین تھا کہ ابھی وہ غش کھا کر گر پڑے گا۔

زار روس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اسے نیند کیسے آ سکتی تھی۔ اس لئے اس نے باقی رات شیکسپیئر کا عظیم ڈرامہ ''جولیس سیزر'' پڑھنے میں گزار دی۔

دوسری صبح کوئی گیارہ بجے کے قریب اس نے عام قلم سے دستبرداری کی عبارت پر دستخط کر دیئے اور کہا ''خدا کا شکر ہے، اب میں اپنی مرضی سے جو چاہوں گا کروں گا۔ میں کریمیا میں اپنے گھر میں چلا جاؤں گا اور وہاں پھول اگاؤں گا۔''

زار اور اس کے کنبے نے اپنی زندگی کے آخری چند ماہ یورال پہاڑوں کی ترائی میں ایک چھوٹے سے قصبے کے مضافات میں دو کمروں میں گزارے۔ انقلابیوں نے انہیں وہاں مقید کر رکھا تھا اور وہ انہیں دہقانوں جیسا کھانا دیتے تھے۔ انہیں شکر، دودھ، کافی، مکھن، نمک کچھ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ انہیں دن میں صرف دو بار موٹی سی کالی روٹی اور سبزیوں کا شوربہ دیا جاتا تھا۔

ان کمروں کے دریچے بند رہتے تھے اور انہیں باہر دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک دن چھوٹی شہزادی انستاسیا نے تازہ ہوا کے لئے ایک دریچہ کھولا تو ایک سپاہی نے اس پر گولی چلا دی۔ انہیں ہر روز ایک چھوٹے سے باغیچے میں صرف پانچ منٹ کے لئے چہل قدمی کی اجازت دی جاتی تھی۔ ننھا شہزادہ زاروچ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس سے چلا پھرا بھی نہ جاتا تھا۔ اس لئے اس کا باپ اسے گود میں اٹھا لیا کرتا تھا۔

ان کے گھر کے گرد پہرا دینے والے سپاہی اکثر نیم برہنگی کی حالت میں مکان کے آس پاس گھوما کرتے تھے اور زار کی چھوٹی شہزادیوں پر فحش فقرے کسا کرتے اور رات کو ان کی کھڑکیوں کے نیچے گندے گانے گاتے۔ ایک دن ایک سپاہی نے ملکہ کی ایک کتاب اور روپے چھین لئے اور بڑے حقارت آمیز انداز میں کہنے لگا۔ ''اب تمہیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔''

زار برگشتگی تقدیر سے اس قدر حواس کھو چکا تھا کہ اس نے اس واقعہ کی کسی سے شکایت نہ کی، لیکن اس کی بیوی بڑی دھڑلے کی عورت تھی۔ اس نے بڑی شد و مد سے خدا

کے حضور میں شکایت کی کہ وہ ظالموں سے اس کا انتقام لے۔

آخر 16 جولائی 1918ء کو آدھی رات سے کچھ قبل پہرے دار فوج کے کپتان نے زار اور اس کے کنبے کو نیند سے بیدار کیا اور ان کو کہا کہ قصبے میں فسادات شروع ہو چکے ہیں، اس لئے وہ جلدی سے کپڑے پہن کر نیچے تہہ خانے میں چلے جائیں اور وہاں اس موٹر کار کا انتظار کریں جو انہیں ایک محفوظ جگہ لے جائے گی۔ جب وہ لوگ اس تہہ خانے میں پہنچے تو خوف کے مارے ان کی ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی۔

دوسرے ہی لمحے سپاہی بندوق اور سنگین تانے تہہ خانے میں وارد ہوئے اور چلا کر کہنے لگے، ''تمہارے حامیوں نے تمہیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے، اب ہم تمہیں ہلاک کرنے آئے ہیں۔''

اگلے لمحے ایک سپاہی نے زار پر گولی چلائی جو اس کے دل میں اتر گئی اور وہ وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد سپاہیوں نے ملکہ اور شہزادیوں پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ وہ اس قدر مشتعل تھے کہ ان کے نشانے بار بار خطا ہو رہے تھے۔ بیچاری عورتیں چیختی چلاتی ہوئی ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھیں اور ایک دوسرے کے پیچھے چھپ رہی تھیں اور تکیوں کو بطور ڈھال استعمال کر رہی تھیں۔

لیکن سپاہیوں نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ چند منٹوں کے بعد کمرے میں صرف ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی جو اپنی مالکن کو تلاش کر رہا تھا۔ ایک سپاہی نے کتے کو بھی اپنی سنگین میں پرو لیا۔ پھر سپاہیوں نے شاہی لاشوں پر پٹرول چھڑکا اور انہیں آگ لگا دی اور سوختہ لاشوں کو ایک گڑھے میں پھینک دیا۔

چند دنوں کے بعد وہی سپاہی اس تہہ خانے میں گئے۔ وہاں انہیں اندھیرے میں کئی ہیرے چمکتے ہوئے ملے۔ یہ ہیرے شہزادیوں نے اپنے ملبوسات میں چھپا رکھے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ قتل روس کی نئی حکومت کے کسی حکم کے تحت نہیں کیا گیا تھا سوویت حکومت نے اس ظلم کے عوض کئی سپاہی گرفتار کئے۔ ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا اور ان میں سے پانچ کو موت کا سزاوار ٹھہرایا۔ شاہی خاندان کا یہ قتل چند خون کے پیاسے انقلابیوں نے اپنی من مانی سے کیا تھا۔

روس کے شاہی افراد کی سوختہ لاشیں اب پیرس میں دفن ہیں۔ انہیں پیرس تک پہنچانے میں امریکی حکومت نے بڑی مدد دی۔ اور ہوا یوں کہ جنوری 1920ء میں سائبیریا میں مقیم امریکی کونسل جنرل کو اس کے ایک دوست نے ایک بڑا سا صندوق دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اسے ہاربن میں رہنے والے برطانوی سفیر تک پہنچا دے۔ امریکی کونسل جنرل کسی کام سے ہاربن جا رہا تھا۔ اس لئے اس نے ٹرین میں اپنی نشست کے ساتھ ہی وہ صندوق بھی رکھ لیا، چونکہ بلا کی سردی تھی، اس لئے وہ اپنے پاؤں گرم کرنے کی خاطر انہیں زور زور سے صندوق پر مارتا رہا۔ جب ہاربن پہنچا تو اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس صندوق میں زار اور اس کے خاندان کی بچی کھچی ہڈیاں تھیں۔ وہ صندوق پہلے شنگھائی اور وہاں سے پیرس میں بھیج دیا گیا۔ وہ صندوق جب پیرس میں کھولا گیا تو دوسری چیزوں کے علاوہ اس میں سے ملکہ روس کی ایک انگلی بھی تھی جس میں شادی کی انگوٹھی ابھی تک چمک رہی تھی۔

زار کو شیکسپیئر کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے یہ الفاظ بھی یقیناً پڑھے ہوں گے۔ ''جو لوگ اونچی جگہ کھڑے ہوتے ہیں انہیں گرانے کے لئے کئی تند ہوائیں ہوتی ہیں، اور اگر وہ گر جائیں تو ان کا جسم کرچیوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔''

خواتین

ایمی سمپل مکفرسن

وہ بھوک اور خستہ حالی کے عالم میں لاس اینجلز میں داخل ہوئی لیکن ڈیڑھ سال میں دو لاکھ پونڈ کمانے میں کامیاب ہوگئی۔

دنیا کی تاریخ میں کسی عورت کو اخبارات میں اتنی شہرت نہیں ملی جتنی کہ ایمی سمپل مکفرسن کو ملی ہے۔ اگر اس کے بارے میں کسی اخبار میں کوئی غیر ضروری خبر شائع ہو جاتی ہے تو ہزاروں لوگ وہ اخبار دیکھنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں، چند برس ہوئے لاس اینجلز کے ایک اخبار میں شائع ہوا کہ اس نے اپنے بالوں کا رنگ بدل دیا ہے۔ اس روز وہ اخبار اپنی اصل تعداد اشاعت سے تین گنا زیادہ فروخت ہوا۔

ایمی کی داستان حیات الف لیلہ کی کسی داستان سے کم نہیں، آج سے ستر سال قبل وہ کینیڈا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئی۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسے ہر روز پانچ میل کا سفر طے کرنا پڑتا۔ رات کے وقت وہ گھر کے سارے برتن صاف کرتی اور دونوں وقت گائے کا دودھ دوہتی۔

موسم خزاں کے ایک دن کا ذکر ہے کہ ایمی کے گاؤں میں ایک مبلغ آیا جس کا نام رابرٹ سمپل تھا۔ اس کی تبلیغ بڑی پراثر تھی جس سے سارے گاؤں والے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ ایمی اس وقت صرف سترہ سال کی تھی۔ اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور اس پادری کے ساتھ شادی کر کے چین چلی گئی۔

دو سال کے بعد چین میں اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور وہ ایمی کو مفلس و بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا۔ ان کے ہاں ایک بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ اس وقت ایمی انیس سال کی تھی۔ اس نے اپنا اثاثہ جمع کیا اور بچے کے ساتھ نیویارک چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے رابرٹ مکفرسن نام کے ایک دکاندار سے شادی کر لی لیکن ان کی ازدواجی زندگی ہمواری سے نہ بسر ہو سکی۔ چھ سال کے بعد اس نے مکفرسن کو طلاق دے دی اور وہ اپنے پہلے اور دوسرے بچے کو لے کر امریکہ کے مغرب کو چل دی۔ اس کے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی کار تھی۔ اب اس کے اندر مذہبی تبلیغ کا جذبہ جاگ اٹھا تھا۔ وہ راستے میں چھوٹے قصبہ جات میں قیام کرتی، لوگوں کو خدا کی راہ پر چلنے کی ہدایت کرتی اور گناہگاروں سے کہتی کہ وہ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔

جب کبھی راستے میں اس کی کار کسی گڑھے میں پھنس جاتی تو اسے وہ رات کار ہی میں گزارنی پڑتی۔ بعض اوقات اسے اور اس کے بچوں کو بھوکا رہنا پڑتا۔ ایک بار وہ سردی سے منجمد ہونے والے تھے۔

آخر ایک شام جب کہ شام کا دھندلکا پھیلا ہوا تھا، یہ حیرتناک عورت لاس اینجلز کے شہر میں داخل ہوئی، یہیں سے اس کا ناقابل یقین مستقبل شروع ہوتا ہے۔ اس کا وہاں کوئی دوست اور مددگار نہیں تھا۔ صرف دو بھوکے بچے، ایک ٹوٹی پھوٹی کار اور بیس پاؤنڈ صرف یہی کچھ اس کا سرمایہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اگلے ڈیڑھ سال کے اندر دو لاکھ پونڈ کی جائداد بنائی اور کیلی فورنیا میں وہ سب سے زیادہ مشہور عورت بن گئی۔

اس نے بڑے جوش وخروش سے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ لوگوں سے کہتی کہ خدا کی بادشاہت بالکل قریب ہے۔ لوگ ہجوم در ہجوم اس کی باتیں سننے آتے۔ اس کے وعظ کے وقت جنوبی کیلی فورنیا کا سب سے بڑا ہال سامعین سے بھر جاتا۔ آخر لوگوں کے ہجوم کے باعث وہ کھلے میدان میں وعظ کرنے لگتی۔ مشتعل ہجوم کو قابو کرنے کے لئے پولیس کی مدد درکار ہوتی۔

ایمی کا وعظ سن کر لاس اینجلز کے لوگ اس کے دیوانے ہو گئے۔ اس سے قبل شہر میں کبھی ایسا ہیجان پیدا نہیں ہوا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کے معتقدین نے تین لاکھ

پونڈ خرچ کر کے اسے ایک خوبصورت کلیسا بنا دیا اور یہ کلیسا اس کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ اس کلیسا میں لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس کا وعظ سننے آیا کرتے، جن لوگوں کو ہال میں جگہ نہ ملتی وہ باہر دروازے کے پاس کھڑے رہتے۔ اس کی پراسرار شخصیت کے طلسم کے زیر اثر گناہگار اس کے سامنے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اپاہج لوگ اس کے پاس آتے، وہ ان کے لئے دعا کرتی اور وہ تندرست ہو جاتے۔ میں نے خود وہ کمرہ دیکھا ہے جن میں اپاہجوں کی کرسیاں اور بیساکھیاں پڑی ہوئی تھیں جن کے سہارے وہ وہاں تک آتے تھے اور وہاں تندرست ہو کر انہیں وہیں چھوڑ جایا کرتے تھے۔

18 مئی 1926ء کی ایک دوپہر کا ذکر ہے کہ ایمی دوپہر کو نہانے کے لئے سمندر کے ساحل پر گئی۔ وہ سمندر میں تیر رہی تھی کہ اچانک وہاں سے غائب ہوگئی۔ اس خبر سے کیلی فورنیا میں ایک طوفان بپا ہوگیا۔ اس کے معتقد اور مداح ساحل پر گئے، وہاں انہوں نے ایمی کی فرضی قبر بنائی اور تیس دن اور تیس راتیں بلا توقف اس کی قبر پر روتے اور مذہبی گیت گاتے رہے۔ ماہی گیروں نے اس کی لاش کی تلاش میں سمندر کھنگال مارا۔ بڑے بڑے ماہر غوطہ زن بلوائے گئے مگر سب بے سود۔ ایمی کی معتقد ایک لڑکی نے سمندر میں کود کر جان دے دی۔ باقی لوگوں کو سمندر میں ڈوبنے سے بچانے کے لئے حکومت نے وہاں پہرہ لگا دیا۔ ایسا مذہبی جنون وہاں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ دنیا بھر کے اخبارات نے یہ خبر جلی حروف میں شائع کی۔ اس کے معتقدین نے اعلان کر دیا کہ جو شخص ایمی کو زندہ یا مردہ لائے گا، اسے پانچ ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔

آخر تیس دن غائب رہنے کے بعد ایمی میکسیکو میں ایک گاؤں کے قریب دکھائی دی۔

یہ تمام عرصہ اس نے کہاں گزارا۔ اس نے بتایا کہ اسے قید میں رکھا گیا تھا۔ جب وہ سمندر میں نہانے گئی تو ایک عورت اس کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس کا بچہ بستر مرگ پر پڑا ہے، اس لئے وہ چل کر اس کے لئے دعا کرے۔ ایمی اس کے ساتھ چلی گئی، وہاں سے اسے اغواء کر لیا گیا۔ اسے کلوروفام سنگھا کر کہیں لے جایا گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ صحرا کے اندر ایک چھوٹے سے کمرے میں محبوس ہے۔ وہاں اسے اکیس دن تک

رکھا گیا، پھر ایک رات وہ وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ چار پانچ دن تپتی ہوئی ریت پر ننگے پاؤں بھاگتی رہی۔

بہت سے لوگوں نے اس سنسنی خیز کہانی پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ تپتی ہوئی ریت پر چلتی رہی ہے تو اس کے پاؤں چھالوں سے محفوظ کیسے تھے۔ اور اس کا چہرہ دھوپ کی تمازت سے سانولا کیوں نہیں ہوا تھا۔ اس کا لباس بالکل صحیح حالت میں تھا اور اس کے بال شانہ کئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ صحرا میں اتنا سفر کرنے کے باوجود اسے پیاس بھی نہ لگی تھی۔

اسے عدالت کے کٹہرے میں لایا گیا۔ کیلی فورنیا کے بہترین وکلاء نے اس پر جرح کی اور اسے طرح طرح کے سوالات سے تنگ کیا لیکن اس کی کہانی کو کوئی نہ جھٹلا سکا۔

کچھ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا، بعض کو اس سے ہمدردی ہوئی، لیکن ایک بات، اس کے دوست اور دشمن سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایمی نے بہت نیک کام کئے ہیں اور وہ بیسویں صدی کی ایک حیرت انگیز شخصیت تھی۔

جوزفین

وہ عام خط و خال کی مالک تھی اس کے باوجود
اس نے عظیم نپولین کو اپنے عشق میں اندھا کر
دیا۔

یہ کہانی ایک غریب لڑکی کی ہے جو جزائر غرب الہند میں ماہی گیروں کی ایک بستی میں پیدا ہوئی جو کھانڈ چینی بنانے والے ایک کارخانے کے اوپر تنگ و تاریک اور گندے کمروں میں رہتی تھی۔ یہ کہانی اس لڑکی کی ہے جس نے تاریخ کے ایک عظیم ترین شخص سے شادی کی اس کا نام ''ماری جوزف روز تا شرلا پیکروی'' تھا لیکن اسے بالعموم ''جوزفین'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

جوزفین نپولین سے تین سال بڑی تھی۔ جب وہ پہلی بار ملے تو جوزفین تیس سال کی اور نپولین ستائیس سال کا تھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی، اس کے دانت خراب تھے اور اس کے دو بچے بھی تھے اور وہ بڑی مقروض تھی۔ اس میں کئی خامیاں تھیں۔ لیکن اسے ایک فن آتا تھا، یعنی وہ جانتی تھی کہ مردوں کو کیسے قابو میں رکھا جاتا ہے۔ وہ بیوہ تھی اور ازدواجی زندگی کا اسے گہرا تجربہ تھا۔

جب انقلاب فرانس میں اس کا پہلا شوہر مارا گیا، تو وہ بے یار و مددگار ہو گئی۔ تب اس نے وہی کچھ کیا جو ایک عقلمند بیوہ کرتی ہے۔ وہ ایک شوہر کی تلاش میں رہنے لگی۔ اس کی سہیلیوں میں سے ایک نے نپولین کے بارے میں بتایا۔ وہ اس وقت تک اتنا مشہور نہیں ہوا

تھا اور نہ ہی اس کے پاس روپیہ پیسہ تھا۔ دراصل وہ ایک لڑائی سے تازہ تازہ لوٹا تھا۔ اور اس کے سر پر ایک گہری چوٹ آئی تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنا سر منڈوا رکھا تھا۔

ایک بار جوزفین نے نپولین کو دور سے دیکھا لیکن اسے کچھ اتنا اچھا نہ لگا۔ لیکن اس کی سہیلی نے اسے بتایا کہ وہ بہت جلد بڑا آدمی بننے والا ہے۔ اس لئے جوزفین اس سے ملنے کا طریقہ سوچنے لگی۔ آخر کار اسے ایک عمدہ طریقہ سوجھا، اس نے اپنے بڑے بیٹے کو جس کی عمر اس وقت بارہ سال تھی، نپولین کے پاس یہ پوچھنے کے لئے بھیجا کہ کیا اس کے پاس اس کے (لڑکے) مرحوم باپ کی تلوار ہے؟ ظاہر ہے نپولین نے ہاں میں جواب دیا۔ دوسرے دن جوزفین بن سنور کر لیکن آنکھوں میں آنسو لئے نپولین کا شکریہ ادا کرنے گئی۔

نپولین جوزفین کی شخصیت اور اس کے غیر معمولی حسن سلوک سے بڑا متاثر ہوا، اسے احساس ہو گیا کہ جوزفین تہذیبی نقطہ نظر سے اس سے بلند سطح پر کھڑی ہے۔ اس لئے جب جوزفین نے اسے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا تو وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور جب وہ اس کے گھر چائے پینے آیا تو جوزفین نے اسے بتایا کہ وہ تاریخ کا ایک مشہور ترین جرنیل بننے والا ہے، تین ماہ کے بعد ان کی منگنی ہو گئی۔

نپولین وقت کا بڑا پابند تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، ''وقت ہی سب کچھ ہے۔'' ایک دفعہ اس نے کہا تھا۔ ''میں جنگ ہار سکتا ہوں لیکن وقت ضائع نہیں کر سکتا۔'' اس کے باوجود وہ اپنی شادی کے موقع پر دو گھنٹے لیٹ آیا۔ پادری اس کے انتظار میں جمائی پر جمائی لینے لگا اور بالآخر تنگ آ کر سو گیا۔

اپنی شادی کے اڑتالیس گھنٹوں کے بعد نپولین اٹلی میں ایک نئی جنگ لڑنے کے لئے چلا گیا۔ اس کی فوج اتنی اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ اتنی زبردست جنگ لڑا کہ سارے یورپ میں ایک برقی رو دوڑ گئی۔ یورپ نے ایسی جنگ گزشتہ ہزار سال میں نہ دیکھی تھی۔

اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ میدان جنگ میں بھی نپولین کو اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ ہر روز جوزفین کو ایک خط لکھ سکے اور پھر اس قسم کے خط! شدت جذبات سے

لبریز 1933ء میں جوزفین کو لکھے گئے نپولین کے آٹھ خطوط لندن میں نیلام عام پر چار ہزار پونڈ میں فروخت کئے گئے تھے، میں نے ان کو پڑھا ہے اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقعت کے مستحق تھے اور آج بھی ہیں، یہاں ایک خط درج کر رہا ہوں۔

''میری پیاری محبوبہ جوزفین!

تم نے مجھے ایک ایسی محبت سے روشناس کروایا ہے جو میرے ہوش وحواس پر چھا گئی ہے۔ میں کچھ کھا نہیں سکتا، سو نہیں سکتا۔ مجھے اپنے دوستوں کی بھی پرواہ نہیں رہی۔ میں شہرت سے بے نیاز ہو گیا ہوں۔ اب میدان جنگ میں صرف اس لئے کامیاب ہونے کی کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں فتح سے خوشی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں فوج کو میدان جنگ میں چھوڑ کر پیرس بھاگ آتا اور تمہارے قدموں سے لپٹ جاتا۔

تم نے میرے اندر ایک لامتناہی محبت بھر دی ہے، میں ہر وقت ایک وجدانی کیفیت میں رہتا ہوں۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ میں تمہاری تصویر نہ دیکھتا ہوں اور اسے چومتا نہ ہوں۔''

یہ خط اس کے بہت سے خطوط سے قدرے کم جذباتی ہے۔ بہت سی عورتیں ایسے خطوط پر جان دینے کو تیار ہو جاتی ہیں لیکن جوزفین کو ان کی زیادہ پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایک دوسرے شخص سے عشق بازی میں مصروف تھی اور اس نے نپولین کے خطوط کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس کی اس حرکت پر نپولین شدت جذبات سے پاگل ہو جایا کرتا تھا۔

آخر وہ جوزفین کی بے اعتنائی سے تنگ آ گیا۔ جب وہ مصر میں لڑ رہا تھا تو اس نے ایک خوبصورت لڑکی کو اپنے ساتھ چائے پینے پر مدعو کیا۔ یہ خبر پیرس میں جوزفین کو پہنچ گئی اور جب نپولین فرانس سے واپس آیا تو جوزفین نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ جیسا کہ ایسے معاملات میں عورتیں کیا کرتی ہیں، دونوں ایک دوسرے سے خوب لڑے، آخر نپولین نے اسے کمرے میں بند کر دیا۔

اور پھر گھریلو الجھنیں بھی تھیں۔ جوزفین نپولین کی بہنوں سے زیادہ مہذب اور شائستہ تھی۔ اس لئے وہ اس سے جلتی تھیں۔ جوزفین کی موجودگی میں وہ دبی دبی رہتی تھیں

اور اندر ہی اندر غصے سے کھولتی رہتی تھیں۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ جوزفین کو ایسا مزا چکھائیں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گی۔ انہوں نے اس کا مذاق اڑانا اور اسے بوڑھی عورت کہنا شروع کر دیا۔ وہ نپولین کو اکساتیں کہ وہ اس ''بوڑھی بڑھیا'' کو طلاق دے کر کسی جوان لڑکی سے شادی کرے۔

لیکن اپنی ہر سازش کے باوجود وہ نپولین کے دل سے جوزفین کی محبت نہ نکال سکیں۔ کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اس نے خود ہی جوزفین کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ اس نے صرف ایک وجہ سے کیا تھا۔ اسے ایک ایسی بیوی کی ضرورت تھی جس کے بطن سے بیٹا پیدا ہو سکے۔ طلاق کے کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کا دل بے حد افسردہ تھا۔ تین دن تک وہ اپنے محل میں افسردہ بیٹھا رہا۔ نہ تو کسی سے کوئی بات کرتا اور نہ ہی کچھ کھاتا پیتا تھا۔ بس خلاؤں میں گھورتا رہتا۔ طلاق کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد نپولین نے آسٹریلیا میں میری لوئی سے شادی کر لی۔

اس شادی کا عجیب پہلو یہ ہے کہ آسٹریلیا کے دوسرے باشندوں کی طرح میری لوئی بھی نپولین سے نفرت کرتی تھی۔ وہ خدا سے دعا مانگتی تھی کہ نپولین سے اس کی شادی نہ ہو لیکن اس کا باپ سیاسی وجوہات کی وجہ سے اس شادی پر مصر تھا۔ اس نے شادی تو کر لی لیکن وہ نپولین کی رتی بھر پرواہ نہیں کرتی تھی اور جب نپولین کو جنگوں میں شکست ہونے لگی تو وہ اسے چھوڑ گئی اور اپنے بیٹے کو بھی اس سے نفرت کرنا سکھا گئی۔

نپولین کی پہلی اور آخری محبت جوزفین تھی۔ جب وہ مرگئی تو نپولین اس کی قبر پر گیا اور رو کر کہنے لگا۔

''میری پیاری جوزفین! تم نے کم از کم مجھے چھوڑا تو نہیں تھا۔''

اس زمین پر نپولین کے منہ سے جو آخری لفظ نکلا تھا وہ جوزفین تھا۔

کیری نیشن

لوگوں نے اسے اس قدر زدو کوب کیا کہ اس
کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں لیکن وہ اپنے نصب
العین سے منحرف نہ ہوئی۔

21 جنوری 1901ء کا ذکر ہے کہ امریکی تاریخ کی سب سے زیادہ سنسنی انگیز خاتون امریکہ کی ریاست کنساس کے شہر وچیتا کی گلیوں میں غصے سے بھری ہوئی نکلی۔ اس کے ہونٹوں پر یہ گیت تھا۔ ''میسی جان باز و آگے بڑھتے چلو'' اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی۔ جب وہ جم برن کے شراب خانے کے پاس پہنچی تو وہ تیزی سے اس کے اندر داخل ہوئی۔ شراب خانے کے اندر کھڑے ہو کر اس نے اپنی کلہاڑی ہوا میں لہرائی اور زور سے چلائی ''یہ خدا کا بازو ہے لوگو میں تمہیں شراب خانے کے دوزخ سے بچانے آئی ہوں۔''

شراب خانے کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ افراتفری میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

شراب خانے کا نگران ایک میز کے نیچے چھپ گیا۔ کیری نیشن نے اپنے کلہاڑے سے شراب کی بوتلیں توڑنا شروع کر دیں۔ وہ بوتلوں کو پکڑتی اور دروازوں کے شیشوں پر دے مارتی۔ چند منٹوں میں شراب خانہ ایسے دکھائی دینے لگا جیسا کہ وہاں کوئی بم گرا ہو۔

کیری نیشن جس نے شراب پینے کے خلاف اپنی مہم شروع کر دی تھی۔ اس کی اس مہم کی خبر تاروں کے ذریعے سے ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اپنی اس جنگ کی بدولت وہ سترہ سال بعد امریکہ کے دستور میں شراب بندی کی دفعہ داخل کروا کر رہی۔

شراب خانوں کے خلاف یہ مہم شروع کرنے کے لئے کیری نیشن کے پاس ٹھوس وجہ موجود تھی۔ شراب نے اس کا گھر برباد کر دیا تھا۔ اس کا خاوند شراب نوشی کی وجہ سے مر گیا تھا۔ اور اسے اور اس کے بچوں کو مفلسی میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے کنساس میں پہلے پہل تبلیغ کے ذریعے شراب خانے بند کرانے کی کوشش کی۔ وہ اپنا پرانا باجا لے کر کسی شراب خانے کے

سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتی اور مذہبی گیتوں کے ذریعے لوگوں کو شراب نہ پینے کا سبق دیا کرتی۔ اس طریقے سے اس نے کچھ شراب خانے بند بھی کروائے۔ لیکن یہ طریقہ بڑا سست تھا۔ وہ اپنے ارادے کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔ وہ ہنگامے کی خواہشمند تھی۔ اس لئے اس نے کلہاڑا پکڑ کر شراب کی بوتلیں توڑنی شروع کر دیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہی ہے لیکن اسے معلوم تھا کہ شراب خانے خدا کی بادشاہت میں ممنوع ہیں۔

کیا وہ کبھی نہیں ڈری تھی؟ بالکل نہیں۔ ایک دفعہ تو شرابیوں نے مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دی تھیں اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ لیکن صحت یاب ہونے پر اس نے پھر اپنی مہم شروع کر دی۔ اسے یقین تھا کہ وہ خدا کے حکم سے ایسا کر رہی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ خدا خود مجھ سے باتیں کیا کرتا ہے۔ جب وہ بائبل کھولتی تو وہ فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنا کرتی تھی۔ اسے بائبل کا ہر لفظ روشن دکھائی دیتا تھا۔ اسے قید کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے جیل میں قیدیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اور جب وہ وہاں سے رہا ہو کر آئی تو اپنا اثر پیچھے چھوڑ آئی۔ جب اسے عدالت میں لایا گیا تو اس نے خود اپنا وکیل بننے پر اصرار کیا، جب جج نے کنساس کے قوانین کا حوالہ دیا تو وہ کہنے لگی کہ مجھ پر کنساس کے قوانین کی بجائے خدا کے قوانین کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔ پھر وہ کھڑی ہو کر بلند آواز سے بائبل پڑھنے لگی۔ ایک دفعہ جج نے غصے میں آ کر اس سے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ''۔ اس پر کیری نیشن کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ جج کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ ''میں آپ کی ماں کے برابر ہوں، اس طرح ہتک آمیز انداز سے بلاتے ہوئے آپ کو کچھ تو خیال کرنا چاہئے تھا۔''

اپنے پہلے خاوند کی وفات کے بعد کیری نیشن نے اپنا، اپنے بچے اور اپنی ساس کا پیٹ پالنے کے لئے ایک سکول میں نوکری کر لی۔ چار سال وہ ملازمت کرتی رہی۔ پھر اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔ ایک دن اس نے خدا کے حضور میں جھک کر یوں دعا مانگی ''خدایا میں اپنے بچے اور اپنی ساس کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میں تم سے مدد کی خواہشمند ہوں اگر میرے لئے دوسری شادی کا راستہ صحیح ہے تو میں شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے اب تک کوئی مرد نہیں چنا ہے۔ میری التجا ہے کہ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو کیونکہ تم اچھے برے کی پہچان رکھتے ہو۔''

چند ماہ کے بعد اس نے ڈیوڈ نیشن سے شادی کر لی جو کہ ایک اخبار کا ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک واعظ بھی تھا۔ کیری نیشن کا خیال تھا کہ خدا نے اس کی دعا سن لی ہے۔ شادی کے بعد ڈیوڈ نیشن ملازمت چھوڑ کر ایک گرجے کا پادری بن گیا۔ کیری کا خیال تھا کہ مذہب کے معاملے میں اس کی معلومات اپنے شوہر سے کہیں زیادہ تھیں۔ اس لئے وہ ہر روز اپنے شوہر کے لئے مذہبی درس تیار کیا کرتی تھی۔ جب ڈیوڈ لوگوں کو درس دینے میں مشغول ہوتا تو کیری سب سے اگلی قطار میں بیٹھی اسے ہدایت دیتی جاتی کہ کن الفاظ پر اس نے آواز بلند کرنی ہے اور کس پر مدھم۔ جب وہ سمجھتی کہ اس کا شوہر کافی دیر تک درس دے چکا ہے تو وہ بلند آواز میں اس سے کہا کرتی ”ڈیوڈ بس کرو، آج کے لئے اتنا درس کافی ہے۔“ اگر وہ فوراً اپنا درس بند نہ کرتا تو وہ منبر پر چڑھ جاتی اور اس کے ہاتھ سے بائبل لے کر بند کر دیتی۔ پھر وہ اس کا ہیٹ اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے گھر جانے کے لئے کہتی۔

چند ماہ کے بعد کلیسا کے بورڈ نے ڈیوڈ سے کہا کہ وہ مستعفی ہو جائے۔ ڈیوڈ نے بخوشی ملازمت چھوڑ دی۔ چند سالوں کے بعد ڈیوڈ نے کیری سے طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کیا تو مقدمے کے فیصلے پر کیری نے کہا ”ڈیوڈ بڑا سست ہے۔ میری اور اس کی رفتارِ زندگی میں بڑا فرق تھا۔ وہ میرا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھا۔“

ایک بار کیری نیشن کو میں نے ایک گرجے میں دیکھا تھا۔ پادری نے کوئی بات کہی جو اسے پسند نہ آئی۔ اس نے اسی وقت پادری کے سامنے اپنا اظہار خیال کر دیا۔ ایک دوسرے موقعے پر وہ بازار میں جا رہی تھی کہ اسے ایک ایسا آدمی نظر آیا جس نے منہ میں سگار دبا رکھا تھا۔ وہ اس کے پاس گئی اور اس کے منہ سے سگار نکال کر کہنے لگی۔ ”تمباکو پینے سے آدمی کے منہ سے کتوں جیسی بو آنے لگتی ہے۔“ وہ نوجوان لڑکیوں کو خبردار کیا کرتی کہ وہ جوان لڑکوں کے ساتھ گھومنے کے لئے ہرگز نہ جایا کریں۔ اس نے زندگی میں اور بھی بہت سے اچھے کام کئے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سال میں اس نے مذہب پر تقریریں کر کے بہت سا روپیہ کمایا۔ جو اس نے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے کنساس میں ایک غریب خانہ بھی قائم کیا جو شرابیوں کی بیواؤں اور بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ ریاست کنساس میں کیری نیشن نامی ایک سڑک بھی ہے جس کے دونوں طرف کلہاڑیوں کے خاکے بنے ہوئے ہیں۔

مسز ابراہام لنکن

اس نے غصے کے عالم میں کافی کی پیالی اپنے
شوہر کے منہ پر دے ماری۔

تقریباً ایک سو چھپیس سال قبل سپرنگ فیلڈ (ریاست الی نوئے) میں امریکہ کے پہلے صدر ابراہام لنکن اور میری ٹوڈ کی شادی انجام پائی۔ لیکن ان کی شادی اتنی بدقسمت اور بدنام ثابت ہوئی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

لنکن نے اپنی شادی کے بارے میں ایک دفعہ ایک کاروباری خط کے آخر میں ایک سفر میں تبصرہ کیا تھا۔ یہ خط اس نے اپنی شادی کے ایک ہفتے کے بعد سیموئل مارشل کو لکھا تھا اور اب یہ خط شکاگو تاریخی سوسائٹی کی ملکیت ہے۔ اپنی شادی کے بارے میں ابراہام لنکن نے یہ سطر لکھی تھی۔ ”میری شادی کے سوا اور کوئی قابل ذکر خبر نہیں اور یہ معاملہ میرے لئے حیرت سے کم نہیں۔“

ولیم، ایچ، ہرڈن بیس سال تک وکالت میں لنکن کا شریکِ کار رہا۔ ہرڈن سے بڑھ کر اور کوئی شخص لنکن کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہرڈن نے ایک بار کہا تھا۔ ”ازدواجی زندگی میں اگر کسی روز لنکن خوش رہا ہو تو مجھے اس کا علم نہیں۔“ ہرڈن ہی کا کہنا ہے کہ ”لنکن کی شادی ہی اس کی غمگینی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔“

ایک بار لنکن کی سوانح عمری لکھنے کے لئے مجھے تین سالوں تک مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا، جہاں تک ممکن ہوا، میں نے اس کی گھریلو زندگی کا بغور مطالعہ کیا۔ اس

مطالعے کے اختتام پر میں اس اذیت ناک نتیجے پر پہنچا کہ ابراہام لنکن کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اس کی شادی تھی۔

میری ٹوڈ سے شادی کے دوسرے ہی دن لنکن کو احساس ہو گیا کہ دونوں زندگی کے ہر شعبے میں بالکل متضاد مزاج کے مالک ہیں اور کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ ان کی خواہشات، تربیت اور ذوق الگ الگ تھے۔

مثلاً میری ٹوڈ بڑی نمائش پسند اور شیخی خور تھی۔ وہ پیرس والوں کے لہجے میں فرانسیسی بولتی، وہ ساری ریاست میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی عورت تھی۔ لیکن اس کے برعکس لنکن اپنی ساری زندگی میں تین سو دن سے زیادہ سکول نہیں گیا تھا۔

میری ٹوڈ کو اپنے خاندان پر بڑا ناز تھا۔ اس کے رشتہ دار گورنر اور فوج کے جرنیل وغیرہ تھے اور اس کا چچا بحری فوج کا سیکرٹری تھا۔

لیکن لنکن کو اپنے خاندان اور شجرہ نسب پر کسی قسم کا فخر نہیں تھا۔ سپرنگ فیلڈ کی رہائش کے دوران میں اس کا بس ایک ہی رشتہ دار اس سے ملنے آیا اور جب وہ مل کر واپس گیا تو اس پر چوری کا الزام لگا دیا گیا۔

میری ٹوڈ لباس اور نمائش کی بڑی شوقین تھی۔ اس کے برعکس لنکن کو اپنی شکل وصورت میں ذرا بھر دلچسپی نہیں تھی۔ بعض اوقات تو اس کی پتلون کے پائنچے اس کے پاؤں میں لٹک رہے ہوتے اور وہ میلے چکٹ ہوتے تھے۔

میری ٹوڈ کو آداب محفل سے پوری واقفیت تھی اور وہ ان کا بڑا خیال کرتی تھی۔

لیکن لنکن کی زیادہ عمر ایک خستہ حال کمرے میں گزری۔ کھانے کی میز پر اسے چھری کانٹے کا استعمال کرنا نہیں آتا تھا۔ جس سے میری کو بڑی کوفت ہوتی تھی۔

میری بڑی مغرور اور ضدی تھی لیکن لنکن بڑا منکسر المزاج تھا۔ میری بڑی حاسد تھی اور اگر لنکن کسی عورت کی طرف یونہی سرسری نظر سے دیکھ بھی لیتا تو وہ ہنگامہ بپا کر دیتی۔ اس کا حسد اتنا غیر معقول، تلخ اور بے بنیاد تھا کہ آج بھی پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

ان کی منگنی کے چند ہی روز کے بعد لنکن نے اسے خط لکھا کہ وہ اس سے اس قدر محبت نہیں کرتا کہ اس سے شادی کر سکے۔ اس نے یہ خط اپنے جوشوا سپیڈ کو دیا کہ میری ٹوڈ کو

پہنچا دے۔ سپیڈ نے یہ خط کھول کر پڑھا اور اسے پھاڑ کر آتش دان میں پھینک دیا اور لنکن کو کہا کہ وہ میری ٹوڈ سے خود ملے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب میری ٹوڈ کو معلوم پڑا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو وہ رونے لگی، لنکن کی سب سے بڑی کمزوری عورت کے آنسو تھے، اس لئے اس نے اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا، اسے چوما اور اپنے الفاظ واپس لے لئے۔

یکم جنوری 1841ء شادی کا دن مقرر ہوا۔ شادی کی ہر تیاری ہو چکی تھی۔ لیکن لنکن غائب ہو چکا تھا؟ کیوں؟ اس کیوں کا جواب میری ٹوڈ کی بہن نے بعد میں ان الفاظ میں دیا۔ ”وہ تو پاگل ہے۔“ دراصل شادی سے پہلے لنکن کا دماغ اس صدمے سے چکرا گیا تھا، وہ ایک کمرے میں پڑا بس یہی الفاظ بار بار دہراتا جا رہا تھا۔ ”میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“ اس کے دوستوں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو ایک چاقو برآمد ہوا۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے بعد آتے تو وہ خودکشی کر چکا ہوتا، وقتی طور پر ان کی شادی ملتوی کر دی گئی۔

اس کے بعد لنکن نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ پردرد خط لکھا۔ یہ خط لفظ بہ لفظ درج ذیل ہے۔

”اب میں قابل رحم اور بدقسمت ترین آدمی ہوں۔ اگر میرے موجودہ احساسات بنی نوع انسانی کے سارے خاندان میں تقسیم کر دیئے جائیں تو دنیا میں ایک شخص بھی نظر نہ آئے گا۔ کیا میری حالت کبھی بہتر ہو گی۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں انتہائی دکھ سے کہتا ہوں کہ میری حالت کبھی بہتر نہیں ہو گی۔ لیکن موجودہ دلی اور ذہنی کیفیت میرے لئے ناقابل برداشت ہے، مجھے مر جانا چاہئے۔ یہی میرے دکھ کا واحد علاج ہے۔“

اس واقعہ کے قریباً دو سال کے بعد تک لنکن میری ٹوڈ سے بے تعلق رہا۔ آخر ایک دن ایک کمرے میں میری ٹوڈ نے لنکن سے کہا کہ اس سے شادی کرنا اس کا فرض ہے اور لنکن نے یہ فرض قبول کر لیا۔

ابراہام لنکن کے بارے میں کتاب لکھنے کے دوران میں مجھے ریاست الی نوئے بھی جانا پڑا وہاں میری ملاقات جمی مائلز سے ہوئی جو سپرنگ فیلڈ کے نزدیک رہتا تھا۔ اس

کے ایک چچا کا نام ہرڈن تھا جو لنکن کے وکالت کے کام میں شریکِ کار تھا۔ مائلز کی ایک چھوٹی پھوپھی ایک بورڈنگ ہاؤس چلاتی تھی، جہاں مسٹر اور مسز لنکن اپنی شادی کے تھوڑے دنوں بعد رہنے کے لئے آئے تھے۔ جمی مائلز نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی پھوپھی سے یہ واقعہ اکثر سنا تھا۔ ''ایک صبح مسٹر اور مسز لنکن بورڈنگ ہاؤس کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے، لنکن کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی جس پر اس کی بیوی کو غصہ آ گیا اور اس نے چائے کی گرم پیالی اٹھا کر لنکن کے منہ پر دے ماری، دوسرے لوگ اس کی اس حرکت پر بڑے پریشان ہوئے، لیکن لنکن خاموش بیٹھا رہا اور اس نے اپنی بیوی کے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ اس نے اسے لعنت ملامت بھی نہ کی۔ وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ بورڈنگ ہاؤس کی ایک مالکن نے ایک کپڑے سے اس کا منہ اور لباس صاف کیا۔ اسی نوعیت کے واقعات لنکن کی گھریلو زندگی میں اکثر پیش آتے رہتے تھے۔

لیکن ہمیں لنکن کی بیوی کو زیادہ کڑی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ انجام کار وہ پاگل ہوگئی اور پاگل ہونے سے قبل ہی پاگل پن کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

ابراہام لنکن کے بارے میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کے تیئس خوشگوار سال بنا کسی شکایت یا غصے کے گزار دیئے۔

شریف لوگ

جنرل سوتر

وہ کروڑوں پانڈ کی جائداد کا مالک تھا لیکن
مرتے وقت اس کے بدن پر چیتھڑے اٹک
رہے تھے۔

24 جنوری 1848ء میں امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے باہر جون ڈبلیو مارشل نام کا ایک بڑھئی دریا کے کنارے شراب کشید کرنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ بنا رہا تھا۔ اسی دن اسے اپنے زیر تعمیر کارخانے سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا زرد پتھر دکھائی دیا۔ جسے اس نے اٹھا لیا۔ کیا وہ سونا تھا؟ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اس نے وہ پتھر ایک مزدور کی بیوی کو دے دیا جو کپڑے دھونے کے لئے صابن ابال رہی تھی۔ اس نے وہ پتھر ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ گرم پانی میں پڑے رہنے سے وہ پتھر شیر کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگا۔ دوسرے دن پو پھٹنے کے ساتھ ہی مارشل نے اپنے گھوڑے پر کاٹھی ڈالی اور اپنے جاگیر دار جون۔ اے سوتر کے گھر کو چل پڑا جو وہاں سے چالیس میل دور تھا۔ مکان میں داخل ہوتے ہی مارشل نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور وہ زرد پتھر نکال کر اپنے مالک کو دکھایا۔ سوتر اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ شدت جذبات سے اس کی سانس الجھنے لگی۔ یہ سونا تھا۔ بالکل خالص سونا، اس کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا تھا۔ جلد ہی وہ اس دنیا کا امیر ترین شخص بن جائے گا۔ جاگیر دار سوتر نے اس دریافت کو ایک راز رکھنا چاہا۔ لیکن کوئی ستاروں کو چمکنے سے کیسے روک سکتا ہے۔ اس نے ایک ایسی قوت کا راز پا لیا تھا جو سارے براعظم کو ہلا سکتی تھی۔ ایک ہی دن میں سوتر کے سارے ملازموں نے اپنے اپنے مقررہ کام چھوڑ دیئے اور وہ لالچ کی دیوانگی میں سونا کھودنے اس جگہ جا پہنچے۔

ایک ہی ہفتے میں وہ سارا علاقہ ایک طوفان بدتمیزی کی لپیٹ میں آ گیا۔ انسانوں سے بھرے گھر ویران ہو گئے۔ ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ گائیں اس انتظار میں تھیں کہ

کوئی ان کا دودھ دوہے، ان کے بچھڑے دودھ کے لئے بے قرار تھے۔ مگر کوئی انہیں ان کی جگہ سے کھولنے والا نہیں تھا۔ بھیڑیوں کو کھلی چھٹی تھی اور وہ مویشیوں پر سر عام ہاتھ صاف کر رہے تھے۔ شدت جذبات سے دیوانے لوگ سارا دن زمین کھودنے میں لگے رہتے اور صبح سے شام تک کوئی دو سو اور کوئی ایک ہزار پونڈ سونا نکالنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی تقدیر بدل رہی تھی۔ برقی تار کے ذریعے سے یہ سنسنی خیز خبر سارے امریکہ میں پھیل گئی لوگ یہ خبر سن کر شدت جذبات سے پاگل ہونے لگے۔ مزدوروں نے مزدوری چھوڑ دی۔ دکانداروں نے دکانیں بند کر دیں، سپاہی فوج سے بھاگ آئے، کسانوں نے اپنی زمینیں تیاگ دیں۔ لوگ ٹڈی دل کی طرح شام سے قبل ہی سونا اگلنے والی جگہ پر پہنچ گئے۔

1849ء کے سرگرم سال میں کوئی سات سو جہاز سان فرانسسکو کی خلیج میں لنگر انداز ہوئے۔ جہاز ران وہاں پہنچتے ہی اپنے جہازوں کو چھوڑ کر سونے کی خاطر پہاڑیوں کی طرف بھاگنے لگتے۔ وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر ہو گیا۔ وہ کسی قانون کے پابند نہیں تھے۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا ہجوم سوتر کی جاگیر پر جمع ہوا تھا۔ لوگ اس کے سرسبز کھیتوں کو پاؤں تلے روند رہے تھے۔ وہ اس کی گندم چرا کر پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ وہ اس کے مویشی ہلاک کرتے اور ان کا گوشت کھا جاتے، یہ سب کچھ ایک حد تک قابل برداشت تھا۔ لیکن جب سونے کے ان دیوانوں نے جون اے سوتر کی جاگیر پر اپنے ذاتی مکان تعمیر کرنا شروع کر دیئے تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ لوگ اس کی زمین کی خرید و فروخت کھلے بندوں کر رہے تھے اور سوتر کو تو وہ یوں سمجھتے تھے کہ جیسے اس کی کوئی ہستی ہی نہ ہو۔

آخر 1850ء کو کیلی فورنیا کی ریاست کو بھی امریکہ میں شامل کر لیا گیا اور وہاں کے بحران زدہ علاقوں پر قانون کا دور دورہ ہو گیا۔ تب سوتر نے تاریخ کا سب سے بڑا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ سان فرانسسکو اور سکرامنٹو کے کے قصبے اس کی نجی جائداد پر ناجائز طور پر تعمیر کئے گئے تھے۔ اس نے ان قصبوں میں رہنے والے لٹیروں کو فوری طور پر وہاں سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس نے ریاست کیلی فورنیا پر پچاس کروڑ پونڈ معاوضے کا دعوئ ان سڑکوں، پلوں اور نہروں کے عوض کر دیا جو اس نے خود تعمیر کروائے تھے لیکن بعد میں چین کی

حکومت نے سوتر کی رضامندی حاصل کیئے بنا عوام کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔
چار سال تک وہ ایک عدالت سے دوسری عدالت میں یہ مقدمہ لڑتا رہا اور آخر 1855ء میں وہ یہ مقدمہ جیت گیا۔ کیلی فورنیا کی عدالت نے یہ فیصلہ سنادیا کہ سان فرانسسکو، سکرامنٹو کے شہر اور دوسرے بیسیوں قصبے اور گاؤں سوتر کی نجی جاگیر پر اس کی اجازت کے بغیر تعمیر کیئے گئے تھے۔ اس سنسنی خیز فیصلے کی خبر نے سان فرانسسکو اور سکرامنٹو کے باشندوں کو ایک زلزلے کی طرح ہلا دیا۔ قانون انہیں ان کے گھر سے باہر نکال رہا تھا۔ لیکن وہ قانون کو مزہ چکھانا چاہتے تھے۔ یہ لوگ اس فیصلے پر مشتعل ہو گئے۔ وہ ایک ہجوم کی شکل میں بندوقیں، کلہاڑے اور مشعلیں پکڑ کر گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے اور قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر دیا۔ انہوں نے عدالت کو آگ لگا دی اور تمام دستاویزات جلا دیں۔ وہ جج جس نے یہ فیصلہ سنایا تھا۔ اسے پکڑ ایک رسے سے پھانسی دینے کی کوشش کی۔ پھر وہ گھوڑوں پر بیٹھ کر سوتر کے مکان پر گئے اور اس کے نیچے بارود رکھ کر اسے ایک پٹاخے کی طرح اڑا دیا۔ انہوں نے اس کا اعلیٰ فرنیچر جلا دیا اور اس کے باغ کے تمام درخت کاٹ ڈالے۔ اور اس کے مویشیوں کو گولیوں سے ہلاک کر دیا۔ انہوں نے سوتر کا ایک بیٹا بھی ہلاک کر دیا اور دوسرے کو خودکشی پر مجبور کر دیا۔ تیسرا لڑکا یورپ کی طرف فرار ہونے کے دوران سمندر میں ڈوب گیا۔ اس اچانک ہنگامے سے سوتر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ اس حادثے کے بیس سال کے بعد تک وہ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن کی عدالتوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ وہ کانگریس سے اپنے حقوق تسلیم کروانا چاہتا تھا۔ بیچارہ سوتر چیتھڑوں میں ملبوس انصاف کے حصول کے لئے ججوں کے پاس مارا مارا پھرتا رہا جب وہ گلیوں میں سے گزرتا تو بچے اس پر ہنستے اور پتھر مارتے۔

آخر 1880ء کے موسم بہار میں وہ واشنگٹن کے ایک تاریک اور خستہ حال کمرے میں مر گیا۔ مرتے وقت اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا مگر اس کے پاس پچاس کروڑ پونڈ کی قانونی ڈگری ضرور تھی، دنیا کا عظیم ترین خزانہ۔ پانچ سالوں کے بعد جون، ڈبلیو مارشل بڑھئی بھی فوت ہو گیا، جس کی دریافت نے مغربی دنیا کی تاریخ میں سب سے زیادہ سونا فراہم کیا تھا وہ بھی اپنے خستہ حال مکان میں مفلسی کی موت مرا۔ دوسرے لوگوں نے اس کی دریافت سے لاکھوں پونڈ کمائے تھے۔ لیکن وہ اپنے کفن کے لئے بھی کوئی پیسہ نہ چھوڑ کر گیا تھا۔

فنکار

جارج گرش ون

اس نے دنیائے موسیقی میں انقلاب برپا کر
دیا اس کے باوجود وہ ہفتے میں تین دفعہ موسیقی
کا سبق لیا کرتا تھا۔

میرے خیال میں جارج گرش ون امریکہ کا مقبول ترین میوزک ڈائریکٹر تھا۔ میں نے ایک بار اس سے اس کی کامیابی کا راز پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ''بڑی سیدھی سادی بات ہے، مجھے معلوم تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور میں اسے حاصل کر کے رہا۔''

مرتے دم تک وہ روز اول کی طرح محنت کرتا رہا۔ جارج گرش ون کے بارے میں جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ حیران کیا ہے وہ یہ ہے کہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود وہ ہفتے میں موسیقی کے تین سبق لیا کرتا تھا اور ہر سبق ڈیڑھ گھنٹہ لمبا ہوتا تھا۔

اس نے اپنا پہلا گیت صرف ایک پونڈ میں فروخت کیا تھا، لیکن نو سال کے بعد اسے اپنے ایک گیت کا معاوضہ دس ہزار پونڈ ملا کرتا تھا۔

پہلی بار جب اس نے ایک تھیٹر میں موسیقی دی تو بری طرح ناکام ہوا۔ تھیٹر والوں نے اسے پانچ پونڈ فی ہفتہ کے حساب سے ملازم رکھا تھا۔ لیکن جب پہلی رات ایک ڈرامے کے دوران وہ موسیقی دے رہا تھا تو اس پر بے حد گھبراہٹ طاری ہو گئی اور گھبراہٹ میں وہ سب کچھ خلط ملط کر گیا۔ سٹیج پر کام کرنے والے ایکٹر اس کا مذاق اڑانے لگے۔ تماشائیوں نے اس پر آوازے کسے، جارج گرش ون بے عزتی کا گہرا احساس لئے تھیٹر

سے باہر نکل آیا۔ غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا ہتک آمیز تجربہ تھا۔ پھر دوبارہ کبھی وہ اس تھیٹر میں نہ گیا۔

گرش ون کو مصور بننے کا شوق تھا۔ لیکن اپنی والدہ کے حسد کی وجہ سے موسیقار بن گیا۔ ہوا یوں کہ جس علاقے میں گرش ون رہا کرتا تھا، وہاں کسی گھر میں پیانو کا ہونا خوشحالی کی علامت تھا۔ ایک دن گرش کی والدہ نے ایک پیانو خرید لیا۔ گرش ون کی والدہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ بھی پیانو خرید کر رہے گی۔ اس لئے اس نے ایک پیانو خرید لیا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ پیانو پرانا تھا اور اسے قسطوں پر خریدا گیا تھا۔ لیکن ایک بات ضرور ہے۔ اگر مسز گرش ون پیانو نہ خریدتی تو اس کا بیٹا اتنا بڑا موسیقار نہ بن سکتا اور امریکی موسیقی کی تاریخ اور ہوتی۔

گرش ون نے اپنا پہلا مقبول عام گیت لکھنے اور مرتب کرنے سے قبل سینکڑوں گیت مرتب کئے لیکن انہیں ردی کی ٹوکری میں پھینکتا رہا۔ اس کا پہلا کامیاب گیت ''سوانی'' تھا۔ یہ گیت پہلے پہل 1918ء میں نیویارک کے کیپٹل تھیٹر میں گایا گیا۔ لیکن کسی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ صرف ال جولسن نے اس گیت کو سراہا۔ وہ اس بات سے واقف تھا کہ اس گیت میں مشہور ہونے کی صلاحیت تھی۔

نو مہینوں کے بعد جب ال جولسن ایک فلم میں کام کر رہا تھا تو فلم والوں کو ایک مقبول عام گیت کی ضرورت تھی۔ اس نے سوانی گایا اور لاکھوں رگوں میں سنسنی دوڑا دی۔ سامعین پاگل ہو گئے۔ پانچ منٹ میں ال جولسن نے ایک ناکام گیت کو کامیابی میں بدل ڈالا۔ ایک مہینے کے اندر اندر آدھی قوم سوانی گا رہی تھی۔ اور دو مہینوں کے اندر اندر لاکھوں لوگ اس کی دھن پر رقص کر رہے تھے۔ جارج گرش ون یہ منظر دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ ایک جگہ سات پونڈ فی ہفتہ پر ملازم تھا۔ اچانک ریکارڈز کی رائلٹی بارہ ہزار پونڈ اسے مل گئی۔ بارہ ہزار پونڈ صرف ایک گیت کا معاوضہ، اس کے خیال کے مطابق تو اتنا روپیہ ساری دنیا میں موجود نہیں تھا۔

جدید تھیٹر میں جارج گرش ون کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کبھی کبھار ہی تھیٹر جایا کرتا تھا۔

حالانکہ اس نے ایسی دھنیں بنائی ہیں جن پر لاکھوں جوڑے والہانہ رقص کرتے تھے لیکن اس نے ازخود کبھی رقص نہیں کیا تھا۔

اس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا۔ کبھی کبھار خاص مواقع پر شراب پیتا۔ وہ نصف شب تک اپنے کام میں مصروف رہتا اور دوپہر سے قبل بستر سے نہ اٹھتا۔ اس کے پاس فرانسیسی تصویروں کا ایک نادر مجموعہ تھا۔

وہ عمر بھر کنوارہ رہا اور ایسٹ بہتر سٹریٹ کے ایک فلیٹ میں رہا۔ لنکن کا یوم ولادت 1924ء ہے۔ موسیقی کے نقادوں کے نزدیک یہ دن امریکی موسیقی کی تاریخ میں انقلابی نقطہ تصور کیا جاتا ہے کیونکہ اس روز جارج گرش ون نے اپنا لافانی گیت ''نیا گیت'' مرتب کیا تھا۔

یہ گیت بالکل اتفاقیہ لکھا گیا تھا۔ پال وٹ مینس نے اسے اپنے کنسرٹ کے لئے لئے جاز کی ایک دھن مرتب کرنے کو کہا۔ لیکن گرش ون ان دنوں ایک منظوم مزاحیہ ڈرامے کے لئے موسیقی کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس لئے وہ پال وٹ مینس سے کیا ہوا وعدہ بھول گیا۔ پھر ایک دن اس نے اخبار میں خبر پڑھی کہ وہ پال وٹ مین کے کنسرٹ کے لئے موسیقی مرتب کر رہا تھا۔ اسے یکدم اپنا کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا، اس لئے وہ فالتو وقت میں اس کنسرٹ کے لئے گیت مرتب کرنے لگا۔ اور اس طرح نیا گیت تخلیق ہوا۔

جس روز وہ کنسرٹ ہونا تھا۔ مرد اور عورتیں تھیٹر میں داخل ہونے کے لئے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ وہ کنسرٹ بڑا کامیاب رہا۔ امریکہ کی موسیقی کی تاریخ میں ایک نئی قسم کی موسیقی جنم لے چکی تھی۔

کیری جیکب بانڈ

وہ ردی کاغذوں پر شعر لکھتے لکھتے بیسویں صدی کا مقبول ترین گیت لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

پچاس سال قبل امریکہ کی ریاست مشی گن کے شمالی حصے میں فرینک بانڈ نام کا ایک ڈاکٹر رہتا تھا۔ زمستان کی ایک یخ بستہ رات کو اچانک اسے ایک مریض کو دیکھنے باہر جانا پڑا۔ رخصت ہونے سے قبل اس نے اپنی بیوی کے لبوں پر بوسہ دیا اور کہا ''میری جان ایسے بے وقت میرا گھر سے نکلنا تمہیں گراں گزرتا ہوگا، لیکن ایک ڈاکٹر کی زندگی کا انداز ہی یہ ہوتا ہے۔ لیکن ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہے اور اس قسم کی جدائیاں محبت کو بڑھاتی ہیں۔''

یہ اس کے آخری الفاظ تھے، ابھی وہ اپنے گھر سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ برف پر سے اس کا پاؤں بری طرح پھسلا۔ اس کے سر پر سخت چوٹ آئی اور اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

ڈاکٹر اپنے پیچھے دس ہزار روپے کا قرضہ اور ایک بچہ چھوڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی بیوی کیری جیکب بانڈ حیران و پریشان تھی کہ اب وہ کیا کرے۔ اسے کسی قسم کی تجارت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ تو بس گھریلو زندگی سے واقفیت رکھتی تھی۔ اسے گھریلو کام کاج کئے بھی عرصہ گزر چکا تھا۔ کیونکہ ایک مدت سے وہ دمے کی مریضہ تھی، اور جب اسے دمے کا دورہ

پڑتا تو اس کا سارا جسم ڈھانچے کی مانند جھومنے لگتا۔

لیکن وہ نہ تو ہمدردی اور نہ ہی خیرات کی خواہش رکھتی تھی۔ اسے اپنے آپ پر بڑا فخر تھا۔ اس لئے اس نے اپنے عزیز رشتہ داروں سے دوری اختیار کی اور شکاگو چلی گئی تاکہ وہاں آئندہ زندگی کی سختیاں عزیز واقارب سے دور رہ کر جھیل سکے۔

اس نے کیا کچھ کیا؟ سب سے پہلے اس نے ایک مسافر خانہ کھولا، لیکن وہ اس کے اخراجات کی متحمل نہ ہوسکی۔ پھر اس نے چینی کے برتنوں پر نقش ونگار بنا کر انہیں فروخت کرنا شروع کیا، لیکن لوگوں نے انہیں کوئی خاص پسندیدگی سے نہ دیکھا۔ پھر وہ گیت لکھنے لگی لیکن کوئی ناشر انہیں خریدنے کو تیار نہ ہوا۔

آخر پندرہ سال بعد کیری جیکب بانڈ نے ''ایک اچھے دن کا اختتام'' کے عنوان سے ایک گیت لکھا، اس گیت کی ساٹھ لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں اور اس نے تقریباً پانچ لاکھ روپیہ کمایا۔

لیکن جب اس نے شروع شروع میں گیت لکھے تو کوئی انہیں دس پونڈ کے عوض بھی خریدنے پر تیار نہیں تھا۔ مفلسی نے اسے چاروں اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے کہ مکان کا کرایہ ادا کر سکے اور اسے ہر وقت یہ خطرہ رہتا تھا کہ کہیں مالک مکان اس کا سامان مکان سے نکال کر باہر فٹ پاتھ پر نہ رکھ دے، سردیوں میں اپنا جسم گرم رکھنے کے لئے اس کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے کہ ایندھن ہی خرید سکتی، وہ اتنی غریب ہوگئی کہ پورے دن میں صرف ایک مرتبہ ہی کھانا کھایا کرتی تھی۔

آخر اس نے فاقوں سے تنگ آکر اپنا بچا کھچا فرنیچر بھی بیچ ڈالا۔

لیکن اس ساری پریشان کن مفلسی کے زمانے میں کیری جیکب بانڈ خوبصورت گیت تخلیق کرتی رہی۔ ایسے گیت جو ایک دن ساری دنیا میں مشہور ہونے تھے اور ہر ایک نے انہیں گاتے پھرنا تھا۔ لیکن مسز بانڈ ان گیتوں کو ردی کے کاغذوں پر لکھا کرتی تھی، کیونکہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ اچھا اور صاف کاغذ خرید سکے۔ وہ موم بتی کی روشنی میں گیت لکھتی تھی، کیونکہ اسے گیس روشن کرنے کی توفیق نہیں تھی۔

وہ اپنے گیت مشتہر کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اشتہار دینے کو پیسے نہیں

تھے۔ اس لئے وہ اشتہاروں کی قیمت چکانے کے لئے ایڈیٹروں کی بیویوں کے کپڑے سیتی تھی۔ شروع شروع میں اسے کسی کلب میں شام کو گیت سنانے کے مشکل سے دس پونڈ ملا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں جب وہ مشہور ہوگئی تو اسے کسی کلب میں گیت سنانے کے لئے بارہ منٹ کا معاوضہ دو سو پونڈ ملتا تھا۔

جب پہلی مرتبہ وہ ایک کلب میں گیت سنانے گئی تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا۔ شکستہ دل ہو کر وہ کلب کے عقبی دروازے سے ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر گلی میں بھاگ آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیکن بعد میں اس کا نام اور تصویر نامور اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئی اور اسے تھیٹر میں گیت سنانے کے عوض دو ہزار پونڈ فی ہفتہ ملتا۔

ایک بار اسے ایک گورنر کے سامنے گیت سنانا تھا۔ لیکن اس موقع پر پہننے کے لئے اس کے پاس لباس نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ بازار سے خرید سکتی۔ اس نے اپنا ٹرنک کھولا، اس میں دو بڑے بڑے پردے پڑے تھے۔ اس نے وہ پردے سی کر لباس تیار کیا۔

پھر ایک دن ایسا آیا کہ مسز بانڈ کو اپنے چند دوستوں کے ساتھ شمالی کیلیفورنیا کے حسین اور پرفریب نظاروں میں ایک دن گزارنے کا موقع ملا۔ اس کا وہ دن بڑے طلسمی انداز میں گزرا، شام کے وقت وہ روبی ڈیکس کی پہاڑی پر کھڑی ڈوبتے ہوئے سورج کا نظارہ کر رہی تھی اور جب سورج سمندر میں غروب ہو رہا تھا تو اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''سچ مچ یہ کتنا اچھا دن ہے۔''

الفاظ اور مصرعے اس کے ذہن میں مرتب ہونے لگے، شکر گزاری کا ایک جذبہ اس کے دل میں جنم لینے لگا۔ اس پر شعر کہنے کا موڈ طاری ہوگیا اور اس نے وہیں دو قطعے لکھ ڈالے، پھر وہ اس کی طرز بھی گنگنانے لگی۔

بات بن گئی تھی۔

موسیقی کے ایک معجزے نے جنم لیا تھا۔ اس نے کسی کوشش کے بغیر ایک ایسے گیت کو تخلیق کیا تھا جس نے بیسویں صدی کی غنائیہ شاعری میں ایک ہلچل بپا کر دی تھی۔

جب مسٹر روز ویلٹ امریکہ کا صدر تھا تو وہ مسز بانڈ کو وائٹ ہاؤس میں بلا کر اس

سے گیت سنا کرتا تھا۔ ''ایک اچھے دن کا اختتام'' صدر ہارڈنگ کا محبوب ترین گیت تھا۔ وہ گیت درج ذیل ہے۔

جب آپ ایک اچھا دن گزار چکے ہوں
اور شام کو اپنے خیالات میں کھوئے ہوں
اور دن کی لائی ہوئی خوشی کی یاد میں
کلیسا کی گھنٹیاں سریلے انداز میں بجتی ہوں
تو کیا آپ جانتے ہیں کہ ایک اچھے دن کا اختتام
جب سورج اپنی آتشیں کرنوں کے ہمراہ ڈوب رہا ہو
اور عزیز دوست جدا ہونے والے ہوں
ایک تھکے ہوئے دل کے لئے کیا اہمیت رکھتا ہے
ایک سفر کے اختتام پر
یہ ایک اچھے دن کا بھی اختتام ہے
لیکن یہ اپنے پیچھے ایک ایسا خیال
چھوڑ کر جا رہا ہے
جو بہت موثر اور سچا ہے
اس اچھے دن نے اپنی یاد کی تصویر
ایسے رنگوں کے ساتھ کھینچ دی ہے
جو کبھی دھندلے نہ پڑیں گے
یہ یاد ایک اچھے دوست سے کم نہیں

گریٹا گاربو

ہالی وڈ کی یہ بے مثال اور زندہ جاوید ایکٹرس
ایک زمانے میں پیٹ پالنے کی خاطر حجام کی
دوکان پر کام کرتی تھی۔

دنیا کی دو مشہور ترین شخصیات کسی زمانے میں حجام کی دکان پر کام کرتی تھیں۔ ایک لندن میں اور دوسری سٹاک ہوم میں۔ وہ دونوں صابن برش پر لگا کر گاہکوں کے چہرے پر ملتے اور بعد میں حجام استرے سے ان کی شیو بنا دیتا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام گریٹا گاربو جبکہ دوسرے کا نام چارلی چپلن ہے۔ ایک زمانے میں وہ اپنی روزی اس طرح سے کمایا کرتے تھے۔

جب گاربو امریکہ گئی تو وہاں کے لوگ اس کے نام سے ناآشنا تھے۔ وہ انگریزی بھی اچھی طرح نہیں بول سکتی تھی۔ اس وقت وہ دس سال کی تھی۔ لیکن بعد ازاں وہ دنیا کی مشہور ترین شخصیت بن گئی، اتنی شہرت تو کسی شہنشاہ کو بھی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔

بچپن میں گاربو کو سکول کے ہنگاموں سے کچھ نفرت تھی، وہ سکول تو جاتی تھی لیکن چوری چھپے وہاں سے کھسک لیتی تھی۔ اور کسی تھیٹر کے باہر ایڑیوں کے بل کھڑی ہو کر ایکٹروں کے مکالمے سننے میں مصروف رہتی اور اگر کبھی موقع ملتا تو چوری چھپے اندر بھی داخل ہو جایا کرتی۔ تھیٹر سے واپسی پر وہ گھر آتی اور اپنے منہ پر پاؤڈر وغیرہ مل کر ایکٹروں جیسی حرکتیں کرنے کی کوشش کیا کرتی۔

جب وہ چودہ سال کی تھی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک غریب کنبے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسے ایک حجام کی دکان پر کام کرنا پڑا۔ لیکن وہ اس کام کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لئے وہ اس کام کو چھوڑ کر ہیٹ فروخت کرنے والی ایک دکان پر ملازم ہو گئی۔

پھر ایک دن اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایسا واقعہ جس نے اس کی زندگی کا رخ بدل ڈالا اور وہ شہرت کی راہ پر گامزن ہو گئی وہ جس دکان میں ملازم تھی، اس کے مالک نے ٹوپیوں کی فروخت کے بارے میں اخبار میں اشتہار دینا تھا۔ اس نے گاربو کے سر پر ہیٹ رکھ کر اس کی تصویر اتروائی اور اسے اخبار میں دے دیا۔ اس تصویر کی وجہ سے اس کے ہیٹوں کی فروخت دگنی ہو گئی۔ یہ دیکھ کر دکان کے مالک نے ہیٹوں کے بارے میں فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم میں گاربو نے بطور ماڈل کام کیا۔

اگر وہ فلم ایک سمجھ دار ڈائریکٹر نے نہ دیکھی ہوتی تو ممکن تھا کہ گاربو آج بھی اسی دکان پر ہیٹ ہی فروخت کر رہی ہوتی۔ لیکن سویڈن کے ڈائریکٹر مارسی سٹیلر نے وہ فلم دیکھ لی اور گاربو سے بڑا متاثر ہوا اور اسے فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی۔ اس وقت گاربو سولہ سال کی تھی۔ مارسی نے اسے ایک ڈرامہ اسکول میں بھیج دیا۔

کچھ عرصے کے بعد مارسی سٹیلر کو اپنی ایک فلم میں ایک چھوٹے سے کردار کے لئے ایک جوان لڑکی کی ضرورت تھی۔ اس نے گاربو کو وہ کردار کرنے کے لئے منتخب کر لیا۔ اس فلم میں اس کے اداکارانہ جوہر نمایاں ہوئے اور وہ شاندار مستقبل کے رستے پر چل دی۔

گریٹا دنیا کی شرمیلی ترین اور نہایت ہی پراسرار عورت ہے۔ وہ ان لوگوں کے لئے بھی بڑی پراسرار ہے جو اس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایکٹرولیس بری نے ایک فلم میں اس کے ساتھ دو سال تک کام کیا۔ لیکن فلم کے سیٹ پر ان دو سالوں میں ایک بار بھی ان کا آمنا سامنا نہ ہوا۔ اس فلم کا نام گرینڈ ہوٹل تھا۔ وہ دونوں مختلف مناظر میں آتے تھے جو مختلف اوقات میں فلمائے گئے تھے۔

ایک بار مشہور امریکی ادیب آرتھر بریس بین گاربو کو دیکھنے کے لئے ہالی وڈ گیا۔ اسے اس فلم کے سیٹ پر لے جایا گیا جس میں گاربو کام کر رہی تھی۔ لیکن گاربو نے اسے ملنے سے انکار کر دیا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بیان کی۔ ”میں مسٹر بریس بین کے مضامین پڑھتی

ہوں اور انہیں پسند کرتی ہوں لیکن میں ان کی موجودگی میں ایکٹنگ نہیں کر سکتی۔“

جب گاربو نے کسی جذباتی منظر میں کام کرنا ہوتا تو اکثر یہ مطالبہ کیا کرتی کہ سیٹ پر کوئی تماشائی نہ ہو حتیٰ کہ ڈائریکٹر بھی وہاں سے چلا جائے صرف کیمرہ مین کی موجودگی میں وہ ایسے مناظر میں کام کیا کرتی تھی۔

فلم کے ایک منظر میں کام کرنے کے بعد وہ ایک دم سٹوڈیو میں اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی اور کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، کمرے میں سے وہ اس وقت باہر نکلا کرتی جب دوسرے منظر کے لئے سیٹ تیار ہو جاتا، سیٹ کے باہر تین چار سپاہی کھڑے رہتے تھے۔ امریکہ کے صدر یا برطانیہ کے شہنشاہ کو دیکھنا اتنا مشکل نہیں ہوتا تھا جس قدر گاربو کو دیکھنے میں اس کے مداحین کو مشکلات پیش آیا کرتی تھیں۔

حالانکہ اس کے لاکھوں مداح تھے لیکن اس کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ وہ احساس کمتری کا شکار تھی۔ اپنی تمام تر شہرت کے باوجود جب کسی اہم شخصیت سے اس کا تعارف کروایا جاتا تو اسے کپکپی چھڑ جاتی، وہ تنہائی کی شوقین تھی۔ وہ اپنا کھانا اپنے وسیع و عریض محل میں تنہا کھاتی تھی۔ اس کے صرف دو دوست اس سے ملنے کو آتے ہیں۔ ٹیلیفون کی گھنٹی کبھی کبھار بجتی ہے۔ قہقہے کبھی کبھار سننے میں آتے ہیں۔

آج امریکہ میں صرف چند افراد کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ گریٹا گاربو کہاں رہتی ہے۔ اس کے ہمسائے بھی اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں کہ عظیم گاربو ان کی ہمسایہ ہے۔ ایک بار اس نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ تین ماہ کا ایڈوانس کرایہ بھی دے دیا۔ لیکن اس میں وہ صرف تین دن رہی کیونکہ ایک فوٹوگرافر کو اس کے مکان کا علم ہو گیا تھا دنیا کے تمام فلمی ستاروں کے مقابلے میں گاربو کا رہن سہن بہت سادہ ہے۔ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی کار میں سفر کرتی ہے۔ کار کی حالت اس قدر خراب ہے کہ اسے دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ اس کے فقط تین نوکر ہیں۔ ایک اس کا ڈرائیور، دوسرا اس کا حبشی ملازم اور تیسرا اس کا خانساماں ہے۔ اس کے ہفتہ وار اخراجات بس بیس ڈالر ہیں۔ حالانکہ اس کی ہفتہ وار آمدنی پندرہ سو ڈالر ہے۔

وہ جانوروں سے بڑی محبت کرتی ہے۔ راستے میں اگر اسے کوئی کتا یا گھوڑا مل جائے تو وہ اسے تھپکی دیئے بنا آگے نہیں بڑھتی۔

اس نے اپنے گھر کے تالاب میں سنہری مچھلیاں اور مینڈک پالے ہوئے ہیں۔

میرے دوست ہومر کرو نے مجھے بتایا ہے کہ جب کبھی وہ گاربو کو ملنے گیا ہے۔ اس نے اسے مینڈکوں کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا ہے اور وہ اس سے بھی سارا وقت مینڈکوں کے بارے میں گفتگو کرتی رہی ہے۔

گریٹا سویٹر اور پتلون میں باہر نکلنا پسند کرتی ہے۔ اسے میک اپ سے نفرت ہے۔ اس نے اپنے گالوں پر کبھی سرخی نہیں لگائی اور نہ ہی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی ہے۔ اس کی انگلیوں کے ناخن بھی پالش سے بے نیاز رہتے ہیں۔

گاربو کے دانت بڑے خوبصورت ہیں اور وہ ان کی پوری پوری حفاظت کرتی ہے۔ اسی لئے اسے کبھی کسی دندان ساز کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ''اپیل ساس'' انگریزی کے یہ دولفظ اس نے سب سے پہلے سیکھے تھے۔ اگر آج کوئی اس سے ہالی وڈ اور اس کی زندگی کے بارے میں مختصر طور پر پوچھے تو وہ یہی جواب دیتی ہے ''اپیل ساس''۔

موزرٹ

اس کے جنازے کے ساتھ ایک شخص بھی
قبرستان تک نہ گیا۔

عظیم روسی وائلن نواز لیوپولڈ جس نے سینکڑوں موسیقار دریافت کئے تھے اور انہیں مختلف ساز بجانے کی تربیت دی، ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگا۔ اگر آپ ایک عظیم موسیقار بننے کے خواہشمند ہیں تو آپ کو کسی غریب گھرانے میں پیدا ہونا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز ہے مگر ہے ضرور، اور میں اسے محسوس بھی کرتا ہوں اور جو مفلسی کی روح میں نہاں ہے، وہ بڑی پراسرار، بڑی خوبصورت، بڑی طاقت ور اور بڑی نازک ہے۔

موزرٹ اتنا غریب ہوتا تھا کہ اس کے پاس اپنے شکستہ حال اور یخ بستہ کمرے کو گرم کرنے کے لئے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے کہ چند لکڑیاں ہی خرید سکے۔ وہ اپنی پرانی جرابوں میں اپنے ہاتھ لپیٹے، موسیقی کی وہ مقدس دھنیں مرتب کرنے میں مصروف رہتا جنھوں نے اسے لافانی کر دیا۔

وہ پینتیس سال کی عمر میں تپ دق سے مر گیا۔ سردی اور بھوک مسلسل اس کی قوت برداشت پر کاری ضرب لگاتے رہے۔ اس کی زندگی میں زیادہ دن ایسے گزرے جب اسے بس ایک وقت کے کھانے پر قناعت کرنا پڑی تھی۔ جب وہ مرا تو اس کے کفن دفن پر صرف پندرہ روپے خرچ ہوئے اور وہ بھی لوگوں نے چندے کی صورت میں جمع کئے۔ اس کے جنازے کے پیچھے صرف چھ آدمی تھے اور وہ بھی جب بارش ہونے لگی تو راستے ہی سے گھر

واپس چلے گئے۔

ہیرلڈ سٹفورڈ جو وکٹر ہربرٹ کا یار غار تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ جب وکٹر ہربرٹ پہلی بار امریکہ گیا تو وہ کئی کئی ماہ تک صرف ایک قمیض میں گزارا کیا کرتا تھا اور جب وہ میلی ہو جاتی تھی تو اس کی بیوی جتنی دیر اسے دھونے، سکھانے اور استری کرنے میں صرف کرتی، وہ یہ سارا وقت بستر میں بنا قمیض کے لیٹا رہتا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں یہ گیت بچے بچے کی زبان پر تھا ''بہت بہت دور ہے ٹیپر یری ابھی۔'' کسی جنگ میں کوئی گیت اتنا مقبول نہیں ہوا۔لیکن یہ گیت لکھنے والا شاعر اپنی روٹی کمانے کی خاطر دن کو مچھلیاں فروخت کیا کرتا اور رات کو کسی تھیٹر میں اداکاری کیا کرتا تھا۔

دنیا کے مقبول ترین گیتوں میں سے ایک یہ بھی ہے ''سونے میں چاندی کی تاریں۔'' ہارٹ پی ڈکنز نے یہ گیت اپنی بیوی کو محبت کے تحفہ کے طور پر پیش کیا تھا، یہ گیت ایک رسالے میں شائع ہوا اور ہارٹ کو اس کا معاوضہ صرف تین پونڈ ملا۔ بعد ازاں میاں بیوی کے مابین کوئی جھگڑا ہو گیا اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔آج سے چالیس سال قبل ہارٹ بڑی خستگی اور مفلسی کی حالت میں ایک تنگ و تاریک کمرے میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔اس کے سرہانے ایک میز پڑی ہوئی تھی جس پر ایک کھلا کاغذ رکھا ہوا تھا۔ اس کاغذ پر یہ الفاظ رقم تھے۔''بڑھاپے کی منازل سے اکیلے گزرنا بڑا مشکل ہے۔''

دنیا کی مقبول ترین موسیقی کی کتب میں سے ایک کا مصنف ایک قصائی کا بیٹا ہے جسے اس نے اپنی دکان پر بیٹھے ہوئے شور و غل کے درمیان لکھا تھا۔ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں اس کتاب کی کوئی نہ کوئی دھن ضرور بجائی جاتی ہے۔اس کتاب کا نام ہومورسکو ہے اور اس کا مصنف ہے بوہیمین جو بعد میں انطون ڈوراک کے نام سے مشہور ہوا، جب وہ پچاس سال کا تھا تو امریکہ گیا۔وہ نیویارک کی ہنگامہ خیز زندگی کا مقابلہ نہ کر سکا۔اس لئے وہ اس عظیم شہر کے قریب سپلرل نام کے ایک قصبے میں چلا گیا۔

اس قصبے میں رہتے ہوئے ڈوراک نے بہت سے گیتوں کی بہترین دھنیں مرتب کیں۔وہ سارا دن کھیتوں میں گھومتا رہتا اور نظموں کی دھنیں مرتب کرتا رہتا۔

ڈوراک آج سے سو سال قبل ایک دور افتادہ قصبے بوہیمیا میں پیدا ہوا۔اس نے بڑی کم تعلیم حاصل کی تھی، اس کا باپ قصائی تھا۔اس لئے وہ اس کے ساتھ دکان پر بیٹھتا اور اس کے کام میں ہاتھ بٹاتا لیکن اس کے ذہن میں تو لاکھوں نغموں کی دھنیں بسی ہوئی تھیں۔ گوشت کاٹنے کے ساتھ ساتھ وہ دل ہی دل میں نغموں کی دھنیں بھی مرتب کرتا رہتا۔

آخر اس نے دکان پر جانا چھوڑ دیا اور موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیرگ چلا گیا۔لیکن پیرگ میں اس کے پاس گزر اوقات کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے۔اس لئے وہ گلیوں میں وائلن بجایا کرتا اور اس طرح لوگوں سے پیسے لے کر دو وقت کی روٹی کھاتا۔لیکن آہستہ آہستہ اس کے مالی حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ اسے ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے میں رہنا پڑا۔اس کے باوجود اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ اس مکان کا کرایہ ہی ادا کر سکتا۔اس لئے اس نے دو چار طلبا کو اپنے کمرے میں جگہ دے دی۔

سردیوں میں وہ کمرہ برف کا تودہ بن جاتا تھا اور فاقوں کا مارا ہوا اس کا جسم یہ سردی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔اس کے پاس ایک پرانا پیانو ہوا کرتا تھا جس کے کئی غائب تھے، وہ اسے مرتب کرانے کی خاطر اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر پیسے جمع کرتا رہا، اسی کمرے میں ڈوراک نے پیانو پر کئی دھنیں مرتب کیں لیکن انہیں لکھ نہ سکا۔آخر کیوں؟ کیونکہ اس کے پاس کاغذ خریدنے کے بھی پیسے نہیں تھے۔بعض اوقات تو وہ گلی سے ردی اٹھا کر اس پر لکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

بہر حال ہمیں اس کی مفلسی پر افسوس نہیں کرنا چاہئے کیونکہ اسی بدولت اس کی صلاحیتیں اجاگر ہوئیں۔

والٹ ڈزنی

وہ ایک چوہیا کی بدولت دنیا کا امیر اور مشہور ترین شخص بن گیا۔

پینتیس سال قبل والٹ ڈزنی جو مکی ماؤس اور تھری لٹل پگز کا خالق ہے۔ گمنامی کے گوشے میں پڑا ہوا زندگی کے دن گزار رہا تھا، لیکن آج اس کا شمار دنیا کی مشہور ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔

تیس سال قبل والٹ ڈزنی مفلسی کے ہاتھوں بڑا تنگ تھا، بعض اوقات اس کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ دو وقت کا کھانا ہی کھا سکتا، لیکن آج اس کی شہرت قطب شمالی سے لے کر لنکا کے چائے کے کھیتوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ قطب شمالی کے اسکیمو بھی اس کی فلموں کے دلدادہ ہیں۔

تیس سال قبل والٹ ڈزنی مفلوک الحال تھا لیکن آج اس کی دولت کا اندازہ کرنا مشکل ہے، اگر وہ چاہے تو دنیا کی بیش قیمت کار ''رولز رائس'' بخوبی خرید سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اس کے پاس ایک پرانی کار ہے جو اس نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی۔ وہ اپنا سارا نفع دوبارہ اپنے کاروبار میں لگا دیا کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ لاکھوں روپیہ یونہی بے کار جمع کرنے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں، وہ تو اس روپے سے زیادہ فلمیں بنانا چاہتا ہے۔

والٹ ڈزنی شہر کنساس کا رہائشی تھا اور وہ آرٹسٹ بننے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس لئے وہ ایک دن ''کنساس سٹی سٹار'' کے دفتر میں کوئی ملازمت حاصل کرنے گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اس کی کچھ ڈرائنگز دیکھ کر اس کی حوصلہ شکنی کی اور اسے کہا کہ اس کے اندر آرٹسٹ

بننے کی کوئی اہلیت نہیں ہے، والٹ ڈزنی شکستہ دل ہو کر واپس چلا آیا۔

آخر کار اسے گرجا گھروں کے لئے ڈرائنگ اور تصویریں وغیرہ بنانے کے لئے ایک معمولی تنخواہ کی ملازمت مل گئی۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اپنا الگ سٹوڈیو بنا سکتا، اس لئے اس نے اپنے باپ کے گیراج کو بطور اسٹوڈیو استعمال کرنا شروع کر دیا، وہ گیراج میں کام کرنا بڑا مشکل سمجھتا تھا، لیکن اب وہ جان گیا ہے کہ پٹرول اور گیس کی بو کے درمیان کام کرنے سے اسے ایک ایسا خیال سوجھا تھا جس کی قیمت لاکھوں پونڈز ثابت ہوئی۔

ہوا ایسے کہ ایک روز والٹ ڈزنی گیراج میں بیٹھا کام کر رہا تھا تو ایک چوہیا گیراج کے ایک کونے سے نکلی اور ایک تختے پر چڑھ کر کھیلنے لگی۔ ڈزنی اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر وہ مکان کے اندر گیا اور تھوڑی سی ڈبل روٹی لا کر اسے کھلانے لگا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، وہ چوہیا اس سے مانوس ہوتی گئی، حتیٰ کہ وہ ڈزنی کے ڈرائنگ بورڈ پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور وہ اپنے کام میں مشغول رہتا۔ آخر کار والٹ ڈزنی ہالی وڈ چلا گیا اور وہاں ''آسولڈ'' خرگوش نام کے متحرک کارٹونوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اس کا یہ کام بالکل ناکام ثابت ہوا، اس لئے اس کے دن پھر فاقہ مستی سے گزرنے لگے۔

ایک روز وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کارٹونوں کا کوئی نیا سلسلہ شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اس کے ذہن میں گیراج والی چوہیا گھوم گئی۔ وہ اسی وقت اٹھا اور اس چوہیا کا خاکہ تیار کرنے لگا۔ اس طرح ''مکی ماؤس'' نے جنم لیا۔ شہر کنساس والی چوہیا مدت ہوئی مر چکی ہے۔ لیکن وہ اپنے پیچھے ایک ایسی فلم چھوڑ گئی جس کا شمار دنیا کی بہترین فلموں میں ہوتا ہے۔ مکی ماؤس کو ہر روز اتنے خطوط آتے ہیں کہ دنیا کا مشہور ترین ایکٹر بھی اس ضمن میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کی شہرت ہر بڑے ایکٹر سے زیادہ ہے۔

والٹ ڈزنی آج کل اپنی فلموں کے لئے کوئی ڈرائنگ نہیں بناتا اور نہ ہی وہ ان کی کہانی لکھتا ہے، نہ ہی موسیقی مرتب کرتا ہے۔ یہ سارا کام اب اس کا عملہ کرتا ہے جو پانچ سو افراد پر مشتمل ہے۔

والٹ ڈزنی اپنا سارا وقت اپنی فلموں کے لئے نئے نئے خیالات سوچنے میں گزارتا ہے۔ جب اس کے ذہن میں کوئی نیا خیال آتا ہے تو وہ کہانی کے شعبے میں اس کے

بارے میں گفت وشنید کرتا ہے، تقریباً پچیس سال قبل اس نے اپنے عملے کو ایک ایسی کہانی کے بارے میں فلم بنانے کو کہا جسے اس کی ماں بچپن میں کہانیوں کی ایک کتاب میں سے پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ اس کہانی کا نام تین چھوٹے سور اور ایک بڑا خراب بھیڑیا تھا۔ اس کے نائبین نے کہانی سن کر اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ڈزنی کا کہنا ہے کہ وہ اس کہانی کے بارے میں فلم بنانے کے خیال کو ذہن میں سے نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اسے محسوس ہوتا کہ یہ بات اس کے بس میں نہیں تھی۔ بعد میں جب کبھی وہ عملے سے اس کہانی کے بارے میں فلم بنانے کا ذکر کرتا تو وہ اسے ہمیشہ یہی کہا کرتے ”یہ فلم سخت ناکام ثابت ہوگی۔“

لیکن جب والٹ ڈزنی فلم بنانے پر مصر رہا تو اس کا عملہ خاموش ہو رہا۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق فلم بنانے میں مصروف ہو گئے۔ لیکن کسی کو بھی اس فلم کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔

مکی ماؤس فلم بنانے میں انہیں نوے دن لگے تھے لیکن تین چھوٹے سؤروں پر وہ اتنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ساٹھ دن میں فلم مکمل کر ڈالی۔ اسٹوڈیو میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ فلم کامیاب ہوگی۔ لیکن جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے دنیائے فلم میں تہلکہ مچا دیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس فلم کا گیت ”خراب بھیڑئے سے کون خوفزدہ ہے“ یورپ کے ہر کس و ناکس کی زبان پر تھا۔ بعض سینما گھروں میں وہ فلم سات بار دکھائی گئی۔ متحرک کارٹونوں کی تاریخ میں اس سے زیادہ کسی فلم کو شہرت نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس فلم کی بدولت ڈزنی نے ساٹھ لاکھ پونڈ منافع کمایا۔ حالانکہ اسے تیار کرنے میں اس کے صرف پچیس ہزار پونڈ خرچ ہوئے تھے۔

والٹ ڈزنی کو یقین ہے کہ کامیابی کا راز اپنے کام سے محبت میں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف روپیہ کمانے کا خیال اسے کبھی اچھا نہیں لگا۔ اس کا کام اس کے لئے ایک ولولہ انگیز حقیقت سے کم نہیں۔

”خراب بھیڑیئے سے کون خوفزدہ ہے“ اس گیت کی دھن ڈزنی کے ملازم فرینک چرچل نے پانچ منٹ میں بڑے تساہلانہ انداز میں تیار کی تھی۔ اس گانے کی کامیابی کے فوراً بعد اسے مزید پانچ فلموں کے معاہدے مل گئے۔

موجد

آرول رائٹ

اس نے دنیا کی تاریخ کا روخ بدل دیا لیکن
اس عظیم بات کا اسے احساس تک نہ ہوا۔

ساٹھ سال قبل کی بات ہے کہ امریکہ کی ایک ریاست اوہیو میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا۔ کم از کم اس وقت تو وہ معمولی واقعہ ہی دکھائی پڑتا تھا۔ لیکن اب ہم جانتے ہیں کہ اس واقعے نے ہم سب کی زندگی پر کتنا گہرا اثر کیا ہے اور مستقبل میں یہ ہماری اولاد اور ان کے بچوں پر کس قدر گہرا اثر کرے گا۔

اس یادگار دن کو آرول رائٹ اپنے شہر ڈیوٹن کی لائبریری میں گیا اور اس نے وہاں سے ایک کتاب نکلوائی۔ اس کتاب میں لیلین تھال نام کے ایک جرمن کی داستان حیات تھی جو ایک بڑی پتنگ پر بیٹھ کر اڑا کرتا تھا۔ اس پتنگ میں وہ کوئی انجن استعمال نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اڑ سکتا تھا۔ اس رات آرول رائٹ صبح تک اس کتاب کے مطالعے میں مصروف رہا اور لیلین تھال کے اس معرکے نے اس پر ایک طرح کا جادو کر دیا۔

آرول رائٹ نے اس داستان کا ذکر اپنے بھائی ولبر سے کیا۔ دونوں بھائیوں نے مل کر ایک ایسا کام شروع کر دیا جو ہوائی جہاز کی ایجاد پر ختم ہوا اور جس نے ان کا نام زندہ جاوید کر دیا۔

دونوں بھائیوں نے کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ ہائی سکول تک بھی نہ پڑھے تھے لیکن ان کے پاس ایک چیز ایسی تھی جو تعلیمی سند سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ وہ زندگی میں کوئی اہم کام کرنے کے خواہشمند تھے اور ان کے ارادے بڑے بلند تھے۔ کئی سال قبل جب وہ محض لڑکے تھے تو وہ دیہات میں جا کر مردہ گھوڑوں اور بھینسوں کی ہڈیاں

چنتے اور انہیں کھاد کی فیکٹری میں فروخت کر دیا کرتے۔ پھر وہ لوہے کے ٹکڑے چنتے اور انہیں ایک کباڑیئے کو بیچ دیتے۔ بعد میں انہوں نے ایک چھاپہ خانہ بنایا اور ایک روزنامہ اخبار شائع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کا یہ کاروبار ناکام ثابت ہوا۔ پھر وہ سائیکلوں کی خرید وفروخت اور مرمت کی ایک چھوٹی سی دکان چلانے لگے۔

جسم اور روح کا رابطہ استوار کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کرتے رہے ہوں لیکن اس دوران فضا میں پرواز کرنے کی خواہش کبھی نہ بھولے۔ اتوار کے روز وہ اپنے چھوٹے سے شہر کے نزدیک ایک پہاڑی پر گھنٹوں لیٹے فضا میں محو پرواز عقابوں کو دیکھتے رہے۔

انہوں نے اپنی سائیکلوں کی دکان کے اندر ایک ہوائی سرنگ بنائی اور پروں پر ہوا کے دباؤ کا تجربہ کرنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بہت ساری پتنگیں بنائیں۔ آخرکار انہوں نے ایک بڑی پتنگ بنائی اور اسے پہاڑی پر لے گئے۔ یہ پتنگ انہوں نے کئی سال کے تجربات کے بعد بنائی تھی اور اس میں اپنا بنایا ہوا ایک انجن لگایا تھا۔ 17 دسمبر 1903ء کو انہوں نے اس مشینی پتنگ میں بیٹھ کر اڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ وہ دن تھا جب انسانی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب آیا تھا لیکن اس دن ان کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ ان دونوں بھائیوں میں سے کون اس پتنگ میں بیٹھے۔ آخر انہوں نے ٹاس کیا اور آرول جیت گیا۔ وہ دن بڑا سرد اور دھوپ سے خالی تھا۔ تیز ہوا برف کے گالے فضا میں اچھال رہی تھی۔ اس قدر سردی کے باوجود آرول نے محض سویٹر پہن رکھا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی مشینی پتنگ پر زیادہ بوجھ پڑے۔

ٹھیک دس بج کر پینتیس منٹ پر آرول رائٹ مشینی پتنگ میں سوار ہو گیا۔ اس نے اندر بیٹھ کر مشین کو اسٹارٹ کیا اور پتنگ چیختی چلاتی ہوئی ہوا میں اڑنے لگی۔ مشین کی پشت میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دس بارہ تاریخی سیکنڈ تک مشینی پتنگ ہوا میں اونچی نیچی پرواز کرتی رہی اور پھر تقریباً ایک سوفٹ دور زمین پر اتر گئی۔

یہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ یہ تمدن کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ آخرکار صدیوں پرانا خواب پورا ہو گیا تھا۔ پہلی بار انسان زمین کی بیڑیاں توڑ کر ستاروں کی سمت اڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس کے باوجود آرول رائٹ کا کہنا ہے کہ اس عظیم واقعہ نے اس کے اندر کوئی جذباتی ہیجان پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی امید کے مطابق ہوا تھا۔ اس لئے اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

آرول رائٹ وہ پہلا شخص ہے جس نے ہوا میں پرواز کی تھی۔ لیکن بعد میں مرتے دم تک اس کے پاس پرواز کرنے کا لائسنس نہیں تھا۔ وہ کئی سالوں تک ہوائی جہاز میں سوار تک نہ ہوا۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ اس لئے کہ 1908ء میں جب کہ وہ ورجینیا میں ایک ہوائی جہاز چلا رہا تھا تو اس کے ہوائی جہاز کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کا ساتھی تو ہلاک ہو گیا لیکن آرول رائٹ کی ٹانگ پر شدید ضرب لگی۔ یہ چوٹ اس قدر شدید تھی کہ مرتے دم تک آرول رائٹ درد محسوس کرتا رہا۔

وہ ایک شرمیلا آدمی تھا۔ اسے شہرت سے کچھ دلی نفرت تھی، اس لئے اس نے اپنی داستان حیات اپنے قلم سے لکھنی پسند نہ کی۔ وہ اخباروں اور رسالوں کے لئے اپنی تصویر بھی نہیں دیتا تھا، اور اخبار کے نمائندوں سے بات چیت کرتے وقت ہچکچایا کرتا تھا۔ وہ دونوں بھائی انکساری کے پتلے تھے۔ ایک روز ولبر نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اس کے ساتھ ہی ایک سرخ ربن زمین پر گر پڑا۔ جب اس کی بہن نے پوچھا کہ وہ کیا تھا تو اس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا۔ ''اوہ بہن! تمہیں بتانا بھول گیا، یہ ربن کل شام فرانسیسی حکومت نے اعزازی طور پر مجھے دیا تھا۔''

آرول رائٹ اور ولبر رائٹ دونوں مذہبی نقطہ نگاہ سے بڑے دقیانوسی واقع ہوئے تھے، وہ اتوار کے روز کبھی ہوائی جہاز میں سوار نہ ہوئے۔ ایک دفعہ اتوار کے روز سپین کے بادشاہ نے ان سے کہا کہ وہ اسے اپنے ہوائی جہاز میں سیر کروائیں۔ لیکن دونوں بھائیوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتوار کے دن انہوں نے کبھی ہوائی جہاز میں پرواز نہیں کی۔

دونوں بھائیوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ایک بار ان کے باپ نے کہا تھا کہ اس کے بیٹے بیویوں اور ہوائی جہاز میں سے جس چیز کو چاہے چن سکتے ہیں۔ ان دونوں نے بیویوں کی بجائے ہوائی جہاز کو منتخب کیا۔

البرٹ آئن سٹائن

اسے سکول میں سب سے کند ذہن لڑکا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے کسی قسم کی امید نہ رکھتے تھے۔

چند سال قبل کی بات ہے کہ میں جنوبی جرمنی کے ایک چھوٹے سے قصبے کی گلیوں میں پھر رہا تھا کہ میرے ایک دوست نے جو میرے ساتھ تھا، اچانک رک کر ایک پرچون فروش کی دکان کے اوپر ایک کھڑکی کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا ''کیا آپ نے وہ بالا خانہ دیکھا ہے؟ آئن سٹائن یہیں پیدا ہوا تھا۔''

اس دن تھوڑی دیر کے بعد میری ملاقات آئن سٹائن کے چچا سے ہوئی مجھے وہ کوئی غیر معمولی ذہانت کا مالک دکھائی نہ دیا۔ لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ کیونکہ جب خود البرٹ آئن سٹائن بچہ تھا تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر ذہین نکلے گا۔ آج کل وہ دور حاضر کا عظیم ترین مفکر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آج سے ساٹھ سال قبل وہ ایک سست اور شرمیلا بچہ تھا، اس نے بولنا بھی بڑی مشکل سے سیکھا تھا، وہ اتنا کند ذہن تھا کہ اس کے استاد اس سے تنگ آ چکے تھے اور اس کے والدین اس کو مخبوط الحواس سمجھتے تھے۔

لیکن چند سالوں کے بعد ایک سہانی صبح آئن سٹائن یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا کہ وہ دنیا کے مقبول ترین لوگوں میں سے ایک ہے۔ یہ بات بالکل ناقابل یقین دکھائی دیتی تھی کہ ریاضی کے ایک عام سے پروفیسر کا نام پانچوں براعظموں کے ہزاروں اخبارات

میں جلی حروف سے چھپے۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ شروع شروع میں یہ سب کچھ خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا، دوسرے لوگ تو سمجھنے سے قاصر تھے ہی۔ تاریخ انسانی میں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

آئن سٹائن اتنا ہی عجیب وغریب تھا جتنا کہ اس کا نظریہ اضافیت۔ اسے ان تمام اشیاء سے نفرت تھی، جن پر لوگ جان دیتے ہیں، مثلاً شہرت، دولت، عیش وعشرت۔ ایک بار ایک بحری سفر کے دوران جہاز کے کپتان نے اسے جہاز کے سب سے آراستہ کمرے میں ٹھہرانے کی پیشکش کی لیکن آئن سٹائن نے یہ کہہ کر اس کی پیشکش مسترد کر دی کہ وہ کسی خاص عنایت کو قبول کرنے کی بجائے جہاز کے عرشے پر سفر کرنا زیادہ پسند کرے گا۔

جب آئن سٹائن نے اپنی پچاسویں سالگرہ منائی تو جرمنی کے لوگوں نے اس پر عنایات کی بارش کر دی۔ اس کا ایک مجسمہ تیار کیا گیا، اسے رہائش کے لئے ایک مکان اور سیر کے لئے ایک کشتی پیش کی گئی، لیکن چند سالوں کے بعد ہٹلر کے عہد میں اس کی جائداد ضبط کر لی گئی اور وہ اپنے گاؤں میں جانے پر مجبور ہو گیا، اس نے کئی ہفتے بیلجیم کے ایک قید خانے میں گزارے، جس کے دروازے پر رات کے وقت ایک سپاہی پہرہ دیا کرتا تھا۔

جب وہ نیویارک کے ایک کالج میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے آیا تو وہ اخبارات کے رپورٹروں سے بچنا چاہتا تھا، اس لئے جہاز سے اترتے ہی اس کے دوست اسے خفیہ طور ایک کار میں بٹھا کر لے گئے۔

آئن سٹائن کا کہنا ہے کہ اس کے نظریہ اضافیت کو محض بارہ آدمی سمجھتے ہیں، اگرچہ اس کی وضاحت کرنے کے لئے کوئی دس ہزار کتب لکھی جا چکی ہیں، وہ خود اضافیت کی تشریح اس سادہ مثال سے کیا کرتا تھا۔ جب آپ کسی اچھی سی لڑکی کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھے تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اس کے پاس محض ایک منٹ بیٹھے ہیں۔ لیکن جب آپ ایک جلتے چولہے پر محض ایک منٹ بیٹھیں تو آپ خیال کرتے ہیں کہ آپ وہاں ایک گھنٹہ تک بیٹھے رہے ہیں۔

آئن سٹائن نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی سے دو لڑکے ہیں اور دونوں ہی بڑے ذہین تھے۔ مسز آئن سٹائن تسلیم کرتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر کے نظریہ اضافیت کو خود بھی

نہیں سمجھتی ہیں، لیکن وہ اپنے شوہر کو ضرور سمجھتی ہیں جو کہ ایک بیوی کے لئے اشد ضروری چیز ہے۔

وہ کبھی کبھار اپنے احباب کو چائے پر مدعو کیا کرتی اور پھر اپنے شوہر سے کہا کرتی کہ وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے لیکن وہ تیز لہجے میں کہتا نہیں بالکل نہیں، میں یہاں سے جا رہا ہوں، میں یہاں کام نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی دخل اندازی میری قوت برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔

اس کی بیوی خاموشی سے یہ سب کچھ سنتی رہتی۔ جب وہ اپنے دل کا غبار نکال دیتا تو تھوڑی سی سیاست سے کام لے کر اسے چائے کے کمرے میں لے آتی اور اس طرح اس کے ذہنی اور جسمانی آرام کے لئے کچھ وقت مہیا کرتی جس کی آئن سٹائن کو اشد ضرورت ہوتی۔

اس کی بیوی فراؤ آئن سٹائن کا کہنا ہے کہ اس کا شوہر اپنی سوچ میں تنظیم کو پسند کرتا ہے لیکن اپنی طرز حیات میں باقاعدگی اسے ذرا پسند نہیں تھی۔ وہ جب کبھی جو کچھ کرنا چاہتا ہے، کر گزرتا ہے، اس کے طرز عمل کے دو اصول تھے۔ پہلا، کسی قسم کا اصول نہ بنائیں۔ دوسرا، دوسروں کی رائے کی پرواہ نہ کریں۔

وہ بڑی سادہ زندگی بسر کیا کرتا، وہ بغیر استری کئے ہوئے پرانے لباس میں گھومتا پھرتا، شاید ہی کبھی اس نے ہیٹ پہنا اور غسل خانے میں خوب گاتا اور سیٹیاں بجایا کرتا، وہ نہانے والے ٹب میں بیٹھ کر شیو کرتا اور کبھی شیونگ صابن استعمال نہ کرتا۔ وہ جس صابن سے نہاتا تھا، اسی سے شیو بھی کر لیتا تھا۔ یہ شخص جو کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھا، کہتا تھا کہ دو قسم کا صابن استعمال کرنے سے زندگی بڑی پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

آئن سٹائن نے مجھے ایک مسرور انسان کی حیثیت سے بڑا متاثر کیا۔ اس کے نظریہ اضافیت کے مقابلے میں اس کا فلسفہ مسرت میرے لئے زیادہ اہم ہے۔ وہ کہتا تھا کہ وہ خوش رہتا ہے، کیونکہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا، اسے نہ تو تعریف کی پرواہ تھی اور نہ ہی صلے کی تمنا تھی۔ اس کی خوشی کے ذرائع بڑے سیدھے سادے تھے۔ مثلاً کشتی چلانا، وائلن بجانا وغیرہ۔

آئن سٹائن کی وائلن اسے زندگی کی ہر دوسری چیز سے زیادہ خوشی دیتی تھی۔ وہ کہا کرتا، ''میں اکثر موسیقی میں سوچتا ہوں اور دن کے وقت خیالی پلاؤ بھی موسیقی میں پکاتا ہوں۔''

ایک بار برلن میں ایک ٹرام میں سفر کرتے ہوئے اس نے بے خیالی میں کنڈکٹر سے کہہ دیا کہ اس نے پوری ریزگاری نہیں دی۔ جب کنڈکٹر نے ریزگاری دوبارہ گنی تو وہ صحیح نکلی۔ اس نے ریزگاری دور جدید کے سب سے بڑے حساب دان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو گنتی نہیں آتی۔''

تھامس ایڈیسن

ڈاکٹر اس کے سار کی غیر معمولی ساخت دیکھ
کر پیشینگوئی کرتے کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔

ایک روز مجھے نیو یارک کے ہوٹل وینڈر بلٹ میں دوپہر کا کھانا کھانے کا اتفاق ہوا۔ جب میں نے کھانا کھانے سے قبل اپنا ہیٹ دوسرے لوگوں کی مانند ہوٹل کی ایک ملازمہ لڑکی کے سپرد کر دیا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے میرا ہیٹ بھی کمرے میں پڑے ہوئے دوسرے سینکڑوں ہیٹوں میں رکھ دیا اور اس پر کسی قسم کا شناختی نشان نہ لگایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ دوسرے ہوٹلوں میں تو ہیٹ رکھنے پر شناختی کارڈ بھی ان کے ساتھ لگائے جاتے ہیں لیکن اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ غلطی سے ایک شخص کا ہیٹ دوسرے کو تو نہیں دے دیا کرتی؟ وہ مسکرائی اور کہا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، ہوٹل میں تقریباً دو سو لوگ روزانہ کھانا کھانے آتے ہیں، وہ سبھی اپنا ہیٹ اور کوٹ مجھے دے جاتے ہیں، مجھے ان سب کی شکلیں یاد رہتی ہیں اور میں نے آج تک کبھی غلطی سے ایک شخص کا ہیٹ یا کوٹ دوسرے کو نہیں دیا۔ اس ہوٹل میں ملازمت کرتے ہوئے مجھے پندرہ سال ہو چکے ہیں۔'' جب میں نے منیجر سے اس بات کا ذکر کیا تو اس نے بھی لڑکی کی بات سے اتفاق کیا۔

میرے خیال میں اگر اس لڑکی کی جگہ تھامس ایڈیسن ہوتا تو وہ لاکھوں پونڈ کی تنخواہ میں بھی یہ کام سرانجام نہ دے سکتا۔ ایڈیسن کا حافظہ بہت کمزور تھا، خاص طور پر جوانی میں۔ سکول کے زمانہ میں استاد اسے جو کچھ پڑھایا کرتا وہ ایک دم بھول جاتا۔ اس کا شمار سب سے

نکمے لڑکوں میں ہوتا تھا، اس کے استاد اس سے بے حد تنگ آ چکے تھے۔ ان سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ وہ بہت ہی کند ذہن ہے اور وہ کچھ پڑھ لکھ نہیں سکتا۔ ڈاکٹروں نے اس کے بارے میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ عمر کے کسی حصے میں وہ ذہنی طور پر بالکل ناکارہ ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے سر کی شکل بڑی عجیب وغریب اور غیر معمولی نوعیت کی تھی۔ ایڈیسن اپنی ساری زندگی میں محض تین ماہ سکول گیا۔ پھر اس کی ماں اسے گھر پر ہی پڑھانے لگی۔ اس کی ماں کا یہ کام کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔ کیونکہ ایڈیسن نے اس کی بدولت ہماری اس دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔

لیکن ادھیڑ عمری میں تھامس ایڈیسن کا حافظہ بڑا اچھا ہو گیا تھا اسے سائنس کے بہت سے فارمولے یاد رہتے تھے اور وہ اپنے موضوع کے علاوہ ہر بات کو بھول جایا کرتا تھا۔

ایک روز وہ کسی سائنسی مسئلے کو حل کرنے میں بے حد مشغول تھا۔ اس سوچ و بچار کی حالت میں وہ اپنے مکان کا ٹیکس ادا کرنے متعلقہ دفتر چلا گیا، وہاں لوگوں کی پہلے ہی سے قطار لگی ہوئی تھی، وہ قطار میں کھڑا ہو گیا۔ جب اس کی باری آئی تو کلرک نے اس کا نام پوچھا۔ ایڈیسن خاموش کھڑا اس کا منہ تکنے لگا۔ اسے اپنا نام ہی بھول گیا تھا۔ اس کا ایک ہمسایہ اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر وہ اس کی مدد کو آیا اور کلرک کو اس کا نام بتا دیا۔

ایک زمانے میں اس نے اپنا حافظہ اچھا کرنے کے لئے کئی عملی طریقے بھی اختیار کئے تھے۔

ایڈیسن اپنی لائبریری میں رات گئے تک کام کرتا رہتا تھا۔ ایک صبح وہ ناشتے کا انتظار کر رہا تھا کہ اسے نیند آ گئی اور وہ ناشتے کے انتظار ہی میں سو گیا۔ اس کے ایک اسسٹنٹ کو مذاق سوجھا وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا اور ناشتے کی خالی پلیٹیں اس کے سامنے رکھی ہوئی تھیں، اس نے وہ پلیٹیں ایڈیسن کے سامنے رکھ دیں چند منٹوں کے بعد جب ایڈیسن اٹھا تو اس کی نظر اپنے سامنے پڑی ہوئی خالی پلیٹوں پر پڑی۔ وہ ایک لمحہ کو سوچتا رہا پھر اس نتیجہ پر پہنچا کہ سونے سے قبل اس نے ناشتہ کر لیا ہو گا۔ اس لئے وہ خالی پلیٹوں کو ایک جانب سرکا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

آسا کرے مشہور امریکی ماہر نباتات کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ اسے پچیس ہزار

پودوں کے نام یاد تھے۔ اسی طرح جولیس سیزر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے اپنے ہزاروں سپاہیوں کے نام یاد تھے۔

چارلی چپلن نے سات سال تک اپنا ایک پرائیویٹ سیکرٹری اور پریس ایجنٹ ملازم رکھا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ چارلی چپلن کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ سات سال کے بعد جب وہ ملازمت چھوڑ کر گیا تو چارلی چپلن کو اس کا نام بھی نہیں آتا تھا۔

دنیا کی دوسری سب سے بڑی یونیورسٹی ''الازہر'' قاہرہ میں ہے۔ اس یونیورسٹی میں میٹرک کے طلبا کو قرآن پاک حفظ کرنا پڑتا ہے۔ اس یونیورسٹی میں بیس لاکھ طلبا پڑھتے ہیں۔ کوئی طالب علم اس وقت تک پاس نہیں کیا جاتا جب تک کہ وہ قرآن پاک زبانی نہ سنائے۔

لارڈ بائرن فخر کیا کرتا تھا کہ وہ اپنے تمام شعر زبانی سنا سکتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس سر والٹس سکاٹ کا حافظہ بہت کمزور تھا۔ ایک بار اس نے اپنی ایک نظم کی، لوگوں کے سامنے اس خیال کے تحت کہ وہ بائرن کی لکھی ہوئی ہے، بہت تعریف کی۔

عظیم مؤرخ مکالے کا حافظہ میرے خیال میں سب سے زیادہ شاندار تھا، وہ کسی کتاب کا کوئی صفحہ دیکھ لیتا تو وہ اس کے ذہن میں نقش ہو جاتا، وہ کسی کتاب کا کوئی باب فقط ایک مرتبہ پڑھتا اور پھر اسے لفظ بہ لفظ دہرا دیتا۔ اس نے ملٹن کی لافانی تصنیف ''جنت گم گشتہ'' محض ایک ہی رات میں ختم کر لی۔

تھیوڈور روز ویلٹ کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا۔ وہ لوگوں سے ملنے کی بڑی خواہش رکھتا تھا۔ وہ اپنے ملاقاتیوں کے چہروں کا بڑے غور سے معائنہ کرتا اور ان کے سامنے ان کا نام اتنی بار دہراتا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔ ایک بار وہ ایک جاپانی سے پندرہ سال کے بعد ملا۔ اس جاپانی کو یقین تھا کہ روز ویلٹ اس کا نام بھول چکا ہو گا۔ لیکن جب روز ویلٹ نے اس کی شکل دیکھتے ہی اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تو وہ بڑا حیران ہوا، روز ویلٹ نے خراب سے خراب حالات میں بھی مطالعہ میں محو ہونے کی عادت ڈالی تھی۔ اکثر یوں ہوتا کہ اس کے کمرے کے باہر لوگ مظاہرے کر کے بے حد شور وغل مچاتے لیکن اس کے آدمی جب اسے آ کر ہنگامے سے آگاہ کرتے تو وہ مطالعہ سے

چونک کر کہتا کہ کیا بات ہے، باہر کوئی شور وغل ہو رہا ہے؟

جان بڈر ایک بے حد دولت مند انگریز تھا، اسے فوت ہوئے کافی سال گزر چکے ہیں۔ جب وہ محض دس سال کا تھا تو وہ دو منٹ میں زبانی حساب لگا کر بتا سکتا تھا کہ چار ہزار چار سو چالیس پونڈ پر چار ہزار چار سو چالیس دنوں میں ساڑھے پانچ فیصد سالانہ کے حساب سے کتنا سود بنے گا۔

مشی گن میں ”ریل روڈ جیک“ نام کا ایک شخص رہا کرتا تھا۔ اس کا حافظہ حیرت انگیز تھا۔ بیس سال تک وہ ایک کالج سے دوسرے کالج کے طلبا کو حیران کرتا رہا۔ وہ کالج کی کینٹین میں جاتا اور وہاں بیٹھے ہوئے لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہتا ”میرا نام ریل روڈ جیک“ ہے، مجھ سے تاریخ کا جو چاہے واقعہ پوچھ لو، میں درست جواب دوں گا۔“ ظاہر ہے کہ لڑکے اس میں دلچسپی لینے لگے۔ وہ اس سے بڑے عجیب وغریب سوال پوچھا کرتے مثلاً ”جب سقراط نے شادی کی تو اس کی بیوی کتنے سال کی تھی؟“ اور وہ بڑی روانی سے جواب دیتا، ”سقراط نے چالیس سال کی عمر میں ایک انیس سال کی لڑکی سے شادی کی تھی۔“ یا وہ پوچھا کرتے کہ ”سنگینیں سب سے پہلے کون سی لڑائی میں استعمال کی گئی تھیں؟“ وہ ایک دم جواب دیا کرتا، ”ستائیں جولائی سولہ سو ننانوے میں سکاٹ لینڈ کی جنگ ”کل کرینکی“ میں۔“ ظاہر ہے لڑکے اس سے بہت متاثر ہوا کرتے اور اس کی خوب خاطر تواضع کیا کرتے۔

ہنری فورڈ اس کی قابلیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسے ایک کار تحفے کے طور پر دی تاکہ وہ اس پر سفر کر کے تاریخ کے بارے میں مختلف شہروں میں لیکچر دے۔ لیکن اس نے کار استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے چھکڑے پر ہی سفر جاری رکھا۔ اس نے اپنے چھکڑے کے ایک جانب یہ الفاظ درج کئے ہوئے تھے۔ ”ریل روڈ جیک۔ دنیا کا سب سے بڑا تاریخ دان۔“

مارکونی

جب سے وائرلیس کی ایجاد پر پچاس ہزار پونڈ
ملے تو اس نے سب سے پہلے ایک سائیکل
خریدی۔

چند سال قبل خوش قسمتی سے مجھے ایک ایسے شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا جس کا ہم سب کی زندگیوں پر جامع اثر ہے، اس نے ہماری دنیا کو بدل دیا ہے۔ اس نے ہمارے لئے یہ بات ممکنات میں شامل کر دی کہ آپ روئے زمین پر جہاں کہیں چاہیں ایک سیکنڈ میں اپنا پیغام بھجوا دیں۔ اس نے ہمارے لئے یہ چیز بھی ممکن بنا ڈالی کہ آپ اپنے کمرے میں بیٹھ کر وائرلیس سیٹ کا ڈائل گھمائیں اور بکنگھم پیلس میں سے شہنشاہ کی تقریر سنیں۔

ہم سب مارکونی کو ہمیشہ اطالوی سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت محض اس کا باپ اطالوی تھا، اس کی ماں آئرلینڈ کی رہنے والی تھی لیکن اس کا مکان لندن میں تھا۔ والدہ کی نسبت سے مارکونی کے بال بھورے اور آنکھیں نیلی تھیں، اور وہ اطالوی کی بجائے انگریز زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑی عمدہ انگریزی بولتا تھا، خاص لندن کے لہجے میں۔ بدقسمتی سے موٹر کے ایک حادثے میں اس کی دائیں آنکھ ہمیشہ کے لئے خراب ہوگئی تھی۔

جب میں اس سے گفتگو کرنے میں مصروف تھا تو میں نے بالکل یہ محسوس نہ کیا کہ میں دنیا کی ایک عظیم ترین شخصیت کے سامنے بیٹھا ہوں، بچپن میں میں ایک ایسے اطالوی

سائنسدان کی کہانیاں پڑھتا رہا تھا، جس نے وائرلیس، ٹیلی گرافی ایجاد کی تھی اور اب وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ عظیم آدمی جس نے دنیا میں ایک معجزہ کر دکھایا تھا، میں خود کو ایک خواب کی سی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے ریڈیو کے تجربے میں کس طرح دلچسپی لینا شروع کی تھی، اس نے کہا کہ ایک نوجوان کی حیثیت سے وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا تھا جس سے اسے اتنے روپے مل سکیں کہ وہ دنیا کی سیر کر سکے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اکثر اپنی ماں کے ساتھ اٹلی سے اپنے عزیز و اقارب کو ملنے لندن آیا کرتا تھا۔ فرانس سے گزرنے کے بعد وہ ریل گاڑی کے ڈبے میں کھڑکی کے قریب بیٹھا برف پوش پہاڑوں اور تیز رو دریاؤں کو دیکھتا رہتا۔ یہ سب نظارے اس کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتے تھے۔ اسے بچپن ہی سے سیاحت کا شوق تھا جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ بڑے ہو کر اس نے بجلی کی تاروں سے مختلف تجربے کرنے اور وائرلیس ٹیلیگرافی کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو اسے اس قدر روپیہ ملے گا کہ دنیا بھر کی خوب سیر کر سکے گا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کسی دفتر کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ طبعاً آزاد واقع ہوا تھا۔ مارکونی نے اپنا سارا تجرباتی کام ایک چھوٹی سی کشتی پر کیا، اس کشتی میں اس نے اپنی لیبارٹری بنا رکھی تھی، اسے سفر سے محبت تھی اور اس نے بحر اٹلانٹک کو ستاسی بار عبور کیا۔

مارکونی ابھی نوجوان ہی تھا کہ وہ اپنے گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بے تار برقی پیغام بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ دو میل تک پیغام بھیجنے لگا۔ اپنی اس کامیابی پر وہ بہت خوش ہوا۔ اس کا باپ اسے بار بار کہتا تھا کہ وہ وقت ضائع کر رہا تھا۔ لیکن جب پندرہ برس کے بعد مارکونی اپنی ایجاد کو برطانوی حکومت کے پاس پچاس ہزار پونڈ میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا باپ اس سے بڑا متاثر ہوا۔ میں نے مارکونی سے پوچھا کہ جب پچاس ہزار پونڈ پہلی بار اس کے ہاتھ میں آئے تو اس نے کیا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ سب سے پہلے اس نے بائیسکل خریدا تھا اور حسب معمول اپنے کام میں مشغول ہو گیا تھا۔ روپے کی بہ نسبت اپنے تجربات کی کامیابی اس کے نزدیک زیادہ مسحور کن تھی۔

1901ء میں مارکونی کو یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کا عظیم خواب پورا ہونے والا ہے۔ اس لئے وہ بحیرہ اٹلانٹک عبور کر کے بڑے اعتماد کے ساتھ امریکہ چلا گیا تاکہ برطانیہ میں قائم شدہ اپنے وائرلیس سٹیشن سے وہاں پیغام حاصل کر سکے۔

نیو فاؤنڈ لینڈ میں اتر کر مارکونی نے ایریل کے طور پر ہوا میں ایک پتنگ بھیجی۔ یہ پتنگ ریشمی کپڑے اور بانس کی بنی ہوئی تھی۔ لیکن تیز ہوا نے پتنگ کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ پھر اس نے ایک غبارہ فضا میں بھیجا۔ تند ہوا نے اسے پھاڑ کر سمندر میں پھینک دیا۔ آخر کار اس نے ایک مضبوط پتنگ بنا کر فضا میں کھڑی کر دی اور لندن سے پیغامات سننے میں مصروف ہو گیا۔ وہ گھنٹوں دم سادھے لندن کے سٹیشن سے آنے والے پیغام کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن کوئی پیغام نہ آیا، اس کے وائرلیس میں کسی قسم کی آواز نے حرکت پیدا نہ کی، وہ بڑا مایوس ہوا، اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا تجربہ ناکام ہوا ہے اور اس کی زندگی کا سنہری خواب جھوٹا نکلا ہے۔

تب اچانک اس نے ایک ہلکی سی آواز سنی، پھر دوسری اور پھر تیسری۔ ہاں ہاں یہی اشارہ اس نے لندن کے اسٹیشن والوں سے کرنے کو کہا تھا۔ تین نقطے ''ایس'' کے حرف کی علامت ٹھہرائے گئے تھے جسے ٹیلی گراف آپریٹر استعمال کیا کرتے تھے۔ اپنی کامیابی سے مارکونی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے تجربے کی کامیابی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دے گی۔ اس کا جی چاہا کہ گھر گھر جائے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنی کامیابی کی خبر لوگوں کو سنائے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا، اسے ڈر تھا کہ لوگ اس کی بات کا یقین نہیں کریں گے، اس لئے وہ اڑتالیس گھنٹوں تک خاموش رہا اور اپنا راز کسی کو نہ بتایا، لیکن پھر اس نے ہمت کر کے اپنی کامیابی کی اطلاع تار کے ذریعے لندن پہنچائی، وہاں ایک سنسنی پھیل گئی۔ پانچوں براعظموں کے اخباروں نے مارکونی کی کامیابی کی کہانی جلی حروف میں شائع کی۔ انسان نے ایک بار پھر زمان و مکان پر کامیابی حاصل کر لی تھی اور وہ ایک نئے دور کی دہلیز پر آن کھڑا ہوا تھا۔ وائرلیس ٹیلی گرافی نے جنم لے لیا تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس وقت مارکونی کی عمر کتنی تھی؟ محض ستائیس سال۔ اپنی کامیابی کے فوراً بعد اسے بڑے بڑے لوگوں کے خط آنے لگے۔ ان لوگوں نے بڑی مضحکہ خیز شکایات کی تھیں۔ ان میں سے بعض نے

لکھا تھا کہ برقی لہریں ان کے بدن میں سے گزرنے لگتی ہیں، جو ان کے اعصاب پر سوار ہو کر انہیں رات بھر سونے نہیں دیتی ہیں۔

ان لوگوں میں سے بعض نے مارکونی کو ہلاک کرنے کی دھمکی دی تھی۔ ان میں سے ایک نے جو کہ جرمن تھا، اسے لکھا کہ وہ اسے ہلاک کرنے لندن آ رہا ہے۔ مارکونی نے وہ خط لندن پولیس کے حوالے کر دیا اور حکومت نے اس شخص کا داخلہ لندن میں ممنوع قرار دے دیا۔

ٹیلی ویژن کا معجزہ بھی وائرلیس کی بدولت ہے۔ یہ معجزہ آج سے کافی سال قبل رونما ہو جاتا لیکن پہلی جنگ عظیم اس کے رستے میں حائل ہو گئی۔

مہم باز

ایڈمرل رچرڈ بارڈ

بارہ برس کی عمر میں وہ قطب شمالی جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ نیوی اسے لینے کو تیار نہیں تھی لیکن اب وہ ایک مشہور ایڈمرل تھا۔

1900ء کا ذکر ہے کہ ریاست ورجینیا کے شہر ونچسٹر میں ایک چھوٹا سا لڑکا اپنی ڈائری باقاعدگی سے لکھا کرتا تھا۔ ایڈمرل پرسی نے قطب شمالی پہنچنے کی خاطر جو جدوجہد کی تھی، اس کے بارے میں مختلف کہانیوں سے وہ لڑکا بڑا متاثر ہوا تھا۔ 1900ء کے موسم خزاں میں اس لڑکے نے یہ الفاظ اپنی ڈائری میں رقم کئے۔ ''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ قطب شمالی میں پہنچنے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔'' اس کے فوراً بعد اس نے اپنے اس عظیم معرکے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے بھرپور سردیوں میں گرم کپڑوں کی بجائے محض بنیان اور انڈرویئر پہننا شروع کر دیا تاکہ وہ اپنے اندر سردی کی شدت کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے۔

کئی سال بعد اس لڑکے نے اپنی ڈائری میں لکھے ہوئے الفاظ پورے کر دکھائے اور وہ قطب شمالی پہنچ گیا۔ درحقیقت وہ پہلا آدمی تھا جس نے قطب شمالی پر بذریعہ ہوائی جہاز اولین پرواز کی تھی۔ قطب جنوبی پر اولین پرواز کرنے والا بھی وہی شخص تھا، اس کا نام رچرڈ بارڈ تھا۔

کمانڈر بارڈ نے اعلان کیا تھا کہ قطب جنوبی کے میدانوں میں جو کہ اس وقت

برف سے ڈھکے ہوئے تھے، ان کے نیچے بڑی قیمتی دھاتیں موجود ہیں، اس کی یہ بات بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ قطب شمالی سے کچھ میل ادھر عمدہ کوئلے کی کانیں پائی گئیں ہیں۔ بہت سے ماہرین اراضیات کا یقین ہے کہ قطب جنوبی کے میدانوں میں تیل کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔

بارڈ کی زندگی ایک ایسے لڑکے کی ولولہ انگیز مثال ہے جو اپنے اندر کوئی بہت بڑا کام کرنے کا ابدی جذبہ رکھتا ہو اور جس نے اپنے رستے کی ان گنت رکاوٹوں کے باوجود بڑے معرکے سر کئے۔

اس کی اولین خواہش تھی کہ دنیا بھر کی سیر کرے اور نئے نئے ممالک دیکھے۔ چودہ سال کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہی وہ دنیا کے گرد چکر لگا چکا تھا اور یہ معرکہ اس نے کسی دوسرے کی مدد کے بغیر بذات خود سر کیا تھا۔ وطن واپس آ کر اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ کالج کے دنوں میں وہ اپنا زیادہ وقت مکہ بازی، پہلوانی اور فٹ بال پر صرف کرتا رہا۔ انہی کھیلوں میں اس کے ایک پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی اور ایک گھٹنا خراب ہو گیا۔ وہ اس قدر لنگڑا کر چلنے لگا کہ حکومت نے اسے اٹھائیس سال کی عمر میں ہی جسمانی طور پر ناکارہ ہونے کی وجہ سے نیوی کی ملازمت سے ریٹائرڈ کر دیا۔ ذرا خیال کریں کہ اٹھائیس سال کی عمر میں جسمانی طور پر ناکارہ ہونے کی وجہ سے ملازمت سے ریٹائرڈ ہو جانا کس قدر تعجب انگیز بات ہے، اس کی جگہ اگر کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنی شکست تسلیم کر لیتا۔

لیکن رچرڈ بارڈ نے حوصلہ نہ ہارا، اس کا کہنا تھا کہ آدمی کو کھڑا ہو کر جہاز نہیں چلانا پڑتا۔ وہ ہوائی جہاز چلائے گا اور اس میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرے گا۔ جہاز چلانے کے لئے لنگڑا ہونا یا گھٹنے کی خرابی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اس لئے اس نے ہوائی جہاز کا پائلٹ بننے کا ارادہ کر لیا اور اس میں کامیاب ہو گیا۔ حالانکہ جب وہ ہوائی جہاز چلانا سیکھ رہا تھا تو اس دوران اس کا جہاز دو بار زمین پر گرا اور ایک مرتبہ اس کے جہاز کی ٹکر ایک دوسرے جہاز سے ہو گئی۔

اب اس کے اندر ہوائی معرکوں کا ولولہ بیدار ہو چکا تھا۔ وہ قطب شمالی کے منجمد میدانوں پر پرواز کرنے کی خواہش رکھتا تھا، جہاں اس سے قبل کسی ہوا باز نے پرواز نہیں کی

تھی۔ جب بھی اس نے حکومت سے ایسا کرنے کی درخواست کی، اسے نفی میں جواب دیا گیا بلکہ الٹا اس کا مذاق اڑایا گیا، ایک بار اس نے حکومت سے کہا کہ وہ اسے ہوائی جہاز پر بحیرہ اٹلانٹک عبور کرنے کی اجازت دے دے۔ وہ تجربے کے طور پر ایسا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن حکومت نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

پھر اس نے حکومت سے درخواست کی کہ وہ ان ہوائی جہازوں میں سے ایک ہوائی جہاز اسے دے دے جب وہ امنڈسن قطب شمالی پر پرواز کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حکومت نے پھر اسے صاف صاف جواب دے دیا اور وجہ یہ بتائی کہ اب اس کی شادی ہو چکی ہے۔ حکومت کی جانب سے ان مسلسل مایوسیوں نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس پر ستم یہ کہ اسے دوسری مرتبہ نیوی سے ریٹائر کر دیا گیا۔ اس بار اسے اس وجہ سے ریٹائر کیا گیا کہ وہ لنگڑا ہو چکا تھا اور اس کا ایک پاؤں کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ممکن ہے رچرڈ بارڈ غلطی پر ہو، لیکن اس کے ذہن میں ایک عجیب خیال سمایا ہوا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ہمت اور ذہانت سے انسان ہر خامی پر حاوی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس نے پرائیویٹ کمپنیوں کو ترغیب دینی شروع کر دی کہ وہ اس کی مہمات میں اسے مالی مدد دیں۔ بعض کمپنیاں اسے مدد دینے پر متفق ہو گئیں جس کے بعد اس نے وہ کارنامے دکھائے کہ دنیا حیران و ششدر رہ گئی۔ اس نے بحیرہ اوقیانوس پر پرواز کی۔ اس نے ایک امریکی جھنڈا قطب شمالی پر پھینکا اور وہاں سے مڑ کر دوسرا جھنڈا قطب جنوبی پر گاڑ دیا۔ ان معرکوں کے بعد جب وہ واپس اپنے وطن پہنچا تو بیس لاکھ کے قریب خوشی سے دیوانے لوگوں کا ہجوم اس کے استقبال کے لئے کھڑا تھا۔ اتنا بڑا خوش آمدید روم کے لوگوں نے جولیس سیزر کو بھی نہ کیا ہوگا، جب وہ پومپئی پر فتح حاصل کر کے واپس لوٹا تھا۔

انجام کار امریکہ کی حکومت نے اس نوجوان کو ایڈمرل کا لقب دیا وہ نوجوان جسے چودہ سال قبل ریٹائر کر دیا گیا تھا۔

کولمبس

اس کے ساتھیوں نے تنگ آکر اسے قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

ہر سال بارہ اکتوبر کو اہل امریکہ اپنی تاریخ کے سب سے اہم واقعے کا جشن مناتے ہیں۔ وہ واقعہ کیا ہے؟ کولمبس کا امریکہ دریافت کرنا۔ مگر لطف کی بات یہ ہے کہ کولمبس نے امریکہ بارہ اکتوبر کو نہیں بلکہ تیئس اکتوبر کو دریافت کیا تھا، جو کیلنڈر ہم آج استعمال کرتے ہیں، اسے پوپ گریگوری نے رواج دیا تھا۔ کولمبس نے اس نئے کیلنڈر کا نام بھی سنا تھا۔ اس کے مرنے کے سو سال بعد یہ کیلنڈر رائج ہوا تھا۔ امریکی نو آبادیات نے اس کیلنڈر کو 1752ء میں اختیار کیا، اور اس موقع پر تاریخ بیک وقت گیارہ دن آگے کر دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پرانا کیلنڈر دورہ آفتابی سے گیارہ روز پیچھے تھا، چنانچہ موجودہ کیلنڈر کے مطابق کولمبس نے امریکہ کو بارہ کی بجائے تیئس کو دریافت کیا تھا۔

نوجوانی میں کولمبس نے ایک قزاق جہاز پر سمندر کا سفر کیا تھا۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی، کیونکہ اس زمانے میں اعلیٰ سے اعلیٰ لوگ بھی اپنے لڑکوں کو قزاق جہازوں پر سفر کرنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ اس سے لڑکوں کی خود اعتمادی بڑھتی تھی۔ وہ سمندر کی ہوا کھا کر صحت مند ہو جاتے تھے، دنیا کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور تھوڑی بہت دولت کمانے کا بھی۔ قزاقی کا پیشہ ذرا بھی شرمناک نہیں سمجھا جاتا تھا البتہ ایک عیب تھا۔ قزاقی کرتے ہوئے گرفتار ہو جانا سو عذابوں کے برابر تھا۔

لڑکپن میں کولمبس نے مدرسے میں فیثا غورث کی ایک کتاب پڑھی تھی جس میں لکھا تھا کہ دنیا گول ہے۔ اس طرح کولمبس کو ایک خیال ہاتھ آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر دنیا گول ہے تو ہندوستان پہنچنے کا شارٹ کٹ ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ لیکن یونیورسٹیوں کے عالم، پروفیسروں اور فلسفیوں نے اس کا مذاق اڑایا، ''دیکھو یہ احمق سیدھا مغرب میں جہاز چلا کر ہندوستان جانا چاہتا ہے جبکہ ہندوستان مشرق میں ہے۔ یہ شخص ضرور دیوانہ ہے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا کہ دنیا گول نہیں ہے، ایسا سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ مغرب میں چلتے چلتے ایک دن ایسا آئے گا کہ تمہارا جہاز دنیا کے سرے سے لڑھک کر لامتناہی خلاؤں میں گر جائے گا۔

سترہ سال تک کولمبس نے کوشش کی کہ کوئی اس مہم پر روپیہ لگانے کو تیار ہو جائے۔ لیکن سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر کار مایوس ہو کر وہ اپنا ارادہ ترک کرنے پر آمادہ ہو گیا اور اسپین کی ایک خانقاہ میں جا کر رہنے لگا۔ اس وقت تک وہ پچاس سال کا بھی نہ ہوا تھا۔ لیکن اتنے مصائب اٹھانے اور دل شکستہ ہونے کے باعث اس کے سرخ بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے۔

آخر روم سے پوپ نے ہسپانیہ کی ملکہ ایسابیلیا پر زور دیا کہ وہ کولمبس کی مدد کرے۔ چنانچہ ملکہ نے اسے تیرہ پونڈ بھیجے۔ کولمبس کے پاس پھٹے پرانے کپڑے رہ گئے تھے۔ اس رقم سے اس نے نئے کپڑے اور ایک گدھا خریدا اور ملکہ سے ملنے کو روانہ ہو گیا۔ وہ اتنا غریب تھا کہ راستے میں اسے بھیک مانگنا پڑی۔

ملکہ نے اسے حسب ضرورت جہاز فراہم کر دیئے۔ لیکن اب ملاح بھرتی کرنے کا کام ناممکن نظر آیا۔ ہر شخص اس سفر پر جانے سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ کولمبس گودی پر پہنچا اور اس نے چند ملاحوں کو بڑی دلیری سے پکڑ کر جانے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح اس نے کچھ کی منت سماجت کی، کچھ کو دھمکایا، کچھ کو رشوت دی۔ اس نے جیل سے مجرم تک نکلوائے اور کہا کہ اگر وہ ساتھ چلیں تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔

آخر کار سب کچھ تیار ہو گیا اور جمعہ کے روز 3 اگست 1492ء کو سورج نکلنے سے آدھ گھنٹہ قبل کولمبس اپنے تین جہازوں اور اٹھاسی آدمیوں کے عملے سمیت اس سفر پر روانہ

ہوا جس کا شمار تاریخ عالم کے اہم ترین اور عصر آفرین سفروں میں ہوتا ہے۔

جو نو آبادیاں کولمبس نے نئی دنیا میں قائم کی تھیں، ان کے مقدر میں ناکامی اور تباہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ پہلی نو آبادی کے تمام افراد کو انڈین نے قتل کر ڈالا۔ دوسری نو آبادی کا گورنر کولمبس سے اتنا حسد کرتا تھا کہ اس نے کولمبس پر طرح طرح کے الزامات لگائے اور گرفتار کر کے پابہ زنجیر اسپین بھیج دیا۔ بیشک اسپین پہنچتے ہی اسے رہا کر دیا گیا لیکن ان تمام باتوں سے پیدا ہونے والی جھنجھلاہٹ اور مایوسی نے اس کا دل توڑ دیا۔

کولمبس نے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ جب وہ مرا تو کسی نے اس کی خبر نہ لی، تعظیم نہ کی، تعریفیں نہ کیں، وہ ایک میلے کچیلے بند اور تنگ کمرے میں مرا، اور اس کے کمرے کی دیواروں پر وہ زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں جنہیں بحالت قید اس نے پہنا تھا۔ اس نے ان زنجیروں کو اس لئے وہاں لٹکا رکھا تھا کہ وہ اسے سنگین انداز میں دنیا کی احسان فراموشی اور ہیچ ہونے کی یاد دلاتی رہیں،

کولمبس نے تاریخ کا ایک انتہائی حیرت انگیز اور جرات مندانہ کام انجام دیا تھا۔ لیکن اسے اس سے کیا حاصل ہوا؟ اسے یہ توقع تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو جائے گا۔ لیکن وہ کنگال مر گیا۔ اس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ''امیر البحر اور ہندوستان کا وائسرائے'' کا خطاب اسے دیا جائے گا، لیکن اس کے باوجود اسے کوئی خطاب نہ ملا۔ حد تو یہ ہے کہ جو براعظم اس نے دریافت کیا تھا اسے بھی اس کے نام سے نہ پکارا گیا۔ اسے امیریگو ویسپوچی نامی نقشہ نویس کے نام سے پکارا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک نئی دنیا دریافت کرنے کا صلہ اسے دل شکستگی اور رسوائی کی صورت ملا۔

اسے یہ اطمینان بھی نصیب نہ ہوا کہ وہ یہ جان لیتا کہ اس نے ایک نیا براعظم ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ اس نے بس ہندوستان جانے کا نیا رستہ ڈھونڈا ہے۔ اسی مغالطے میں اس نے امریکہ کے سرخ فام باسیوں کو انڈین کا نام دیا۔

بہر حال کولمبس کے حصے میں ایک بزرگی ضرور آئی، اسے امریکہ کو دریافت کرنے والا پہلا آدمی قرار دیا گیا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ کولمبس سے ایک ہزار سال قبل ایک راہب ہوئے شن نے جو کہ چین کا رہنے والا تھا، امریکہ دریافت کیا تھا اور کولمبس سے

پانچ سال قبل لیف ایرک سن نام کا ایک وائکنگ امریکہ پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ امریکہ کی ریاست میسا چوسٹس میں دریائے چارلس کے کنارے ان مکانات کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں جن کے بارے میں تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ ایرک سن کے بنائے ہوئے ہیں۔

تاریخ میں کولمبس کی ہمیشہ عزت کی جائے گی۔ کیونکہ وہ بڑا اولوالعزم شخص تھا جس کا حوصلہ لحہ بھر کو بھی پست نہیں ہوتا تھا۔ جب ہر شخص سفر جاری رکھنے کا مخالف تھا تو کولمبس اپنی بات پر اڑا رہا۔ جب اس کے ملاحوں پر دہشت غالب آ گئی اور انہوں نے دھمکی دی کہ اگر جہاز کو یورپ کی طرف نہ موڑا گیا تو وہ بغاوت کر کے اسے مار ڈالیں گے تو کولمبس کے پاس ان کی باتوں کا صرف ایک جواب تھا، ''آگے بڑھے چلو! آگے اور آگے۔''

ولفرڈ گرنفل

اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر تین کتے ہلاک کئے اور ان کی کھال اپنے گرد لپیٹ کر ساری رات برف باری کا مقابلہ کرتا رہا۔

اگر خوش لوگوں کے بارے میں سوچا جائے تو دنیا کے مسرور ترین لوگوں میں سے ڈاکٹر گرنفل بھی تھا جس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ لیبراڈور میں گزارا، اس کے بال بھورے، آنکھیں تھکی تھکی اور ہاتھوں کی جلد برف اور ٹھنڈی ہوا سے پھٹ چکی تھی۔ زندگی میں چار مختلف اوقات میں وہ برف کے تودوں پر پھنسا اور وہ ساری ساری رات تیرتی ہوئی برف پر گزارتا رہا۔ وہ لیبراڈور کی ہولناکیوں میں کئی بار گم ہوا اور بعض اوقات سردی اور برف کی شدت سے اس کا جسم منجمد ہوتے ہوتے بچا۔ بعض اوقات تو وہ اتنا بھوکا ہوتا کہ اپنے بوٹوں کے تسمے وغیرہ کھا کر گزارا کرتا۔

جب وہ فوت ہوا تو اس کی عمر ستر سال سے زائد تھی اور اس کے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا۔ لیکن آپ ڈاکٹر گرنفل پر کسی قسم کا ترس نہ کھائیں، مجھے تو بالکل ترس نہیں آتا بلکہ میں الٹا اس پر رشک کرتا ہوں۔ کیونکہ اس نے زندگی میں وہ چیز حاصل کر لی تھی جس کی قدر و منزلت لوگوں کی نظروں میں بہت ہے، یعنی خوشی اور اطمینان۔

پینسٹھ سال قبل ڈاکٹر گرنفل نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی، اور لندن کے فیشن ایبل علاقے مے فیئر میں مطب چلانے لگا، اس کی پریکٹس چل نکلی

اور وہ خوشحال ہو گیا۔ اگر وہ اسی رفتار سے اپنی پریکٹس جاری رکھتا تو تھوڑے ہی عرصہ میں اس کا شمار لندن کی اہم شخصیات میں ہونے لگتا، لیکن وہ مختصر عرصے کے لئے آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ماہی گیروں کے ملک لیبراڈور میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیبراڈور ایک سرد اور ویران ملک ہے جو کینیڈا کے مشرقی ساحل کے ساتھ پندرہ سو میل تک پھیلا ہوا ہے۔ نیو فاؤنڈ لینڈ اس کے جنوب میں ہے اور آبنائے ہڈسن اس کے شمال میں۔ سال کے نو ماہ یہ بدقسمت ملک برف کے نیچے ڈھکا رہتا ہے۔ وہاں کی زمین بالکل بنجر ہے اور وہاں کے باشندے جو کہ زیادہ تر ماہی گیر ہیں۔ اپنے مویشیوں کو وہیل مچھلی کی دموں اور سمندری جڑی بوٹیوں سے پالتے ہیں۔

ڈاکٹر گرنفل جب وہاں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس ویران ملک کے تیس ہزار باشندوں کے لئے ایک بھی ڈاکٹر نہیں تھا۔

اس موسم گرما میں ڈاکٹر گرنفل سے جو کچھ بھی ہو سکا اس نے ان لوگوں کے لئے کیا۔ موسم خزاں کے شروع میں جب وہاں برف گرنی شروع ہوئی تو وہ واپس لندن لوٹ آیا۔ لندن پہنچ کر اس نے سوچا کہ اگر وہ مریضوں کے لئے ساری زندگی نسخے لکھ لکھ کر روپیہ کماتا رہا تو اس سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ڈاکٹر کی زندگی تو انسانیت کی بہبود کے لئے وقف ہونی چاہئے۔ لیبراڈور کی سیر نے اس کے سامنے ایک نیا رستہ کھول دیا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا تھا۔ اس کے خیالات یکسر بدل چکے تھے، لیبراڈور اسے اپنی سمت بلا رہا تھا، اس لئے وہ اپنا سارا سامان لے کر وہاں پہنچ گیا اور مکمل بیالیس برس لیبراڈور کی سختیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ڈاکٹر گرنفل کے اس اقدام نے اسے دنیا کا عزیز ترین ڈاکٹر بنا دیا۔ انگلینڈ کے بادشاہ جارج نے اس کی بے لوث خدمات کے پیش نظر اسے ''نائٹ'' (سردار) کا خطاب دیا۔

ایک بار مجھے ڈاکٹر گرنفل سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ گھنٹوں مجھ سے اپنے غیر معمولی تجربات کا تذکرہ کرتا رہا۔ اس نے مجھے ایک ایسی بوڑھی عورت کا واقعہ سنایا جو برف سے پھسل پڑی تھی اور اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی ٹانگ خراب ہو گئی اور جب میں اسے دیکھنے گیا تو ٹانگ کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ میں نے ٹانگ کو

کاٹ دینا بہتر خیال کیا، لیکن وہ مقدس بڑھیا جو بائبل کے اصولوں کی سخت پابند تھی، اس نے کلوروفارم سونگھنے سے انکار کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ تکلیف خدا نے اس پر نازل کی ہے اور یہ اس کا مذہبی فرض تھا کہ اس درد کو بلا چون و چرا برداشت کرے۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن اس پر کچھ اثر نہ پڑا۔

جب میں اس کی ٹانگ کاٹنے لگا تو اس نے اپنے پانچوں جوان بچوں کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ وہ اسے پکڑے رکھیں۔ ٹانگ کاٹنے کے دوران اس نے اف تک نہ کی۔ زندگی کے اس تجربے نے مجھ پر اتنا گہرا اثر کیا کہ ناقابل بیان ہے۔ ان لوگوں سے مجھے پہلے سے بھی زیادہ محبت ہو گئی۔

لوگ لیبراڈور کے باشندوں کی مدد کے لئے ڈاکٹر گرنفل کو کپڑے اور کتابیں بھیجا کرتے تھے۔ کپڑوں میں شکاری کوٹ اور ہیٹ بھی ہوتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے اسے ایک ایسی کتاب بھیجی جو کہ سو سال پرانی تھی۔

لیبراڈور کے ماہی گیر بڑے توہم پرست، بڑے مذہبی واقع ہوئے ہیں۔ زمین بنجر ہونے کی وجہ سے خوراک کی کمی کے باعث وہ اکثر بھوکے رہتے ہیں۔ ایک بار ڈاکٹر گرنفل ایک الگ تھلگ گاؤں میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس گاؤں کے لوگ بھوک کے مارے قریب المرگ تھے۔ انہوں نے کئی ہفتوں سے سوائے سوکھی روٹی کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان کے پاس اپنے پالتو سؤر موجود تھے۔ لیکن وہ انہیں ذبح نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر گرنفل نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ ایک روز وہ سؤر گاؤں کے گرجا گھر میں داخل ہو گئے اور وہاں سے انہوں نے مقدس بائبل کے کئی اوراق کھا لئے، اب ان لوگوں کے نزدیک وہ سؤر بھی مقدس ہو گئے تھے۔ ان کے اندر خدا داخل ہو گیا تھا اور وہ انہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر گرنفل کی زندگی کا سب سے بڑا ولولہ انگیز واقعہ 1908ء کے ایسٹر کی اتوار کو رونما ہوا۔ ساٹھ میل دور ایک آدمی بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر کو فوری طور پر وہاں جانا پڑا۔ وہ آدمی بہت تکلیف میں تھا۔ اسے آپریشن کی ضرورت تھی۔ اگر آپریشن اگلے ایک دن میں نہ ہوتا تو اس کی موت واقع ہو سکتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر گرنفل نے اپنی کتا گاڑی میں کتے جوتے اور

منزل مقصود کی سمت روانہ ہوا۔ وقت بچانے کے لئے اس نے ایک چھوٹا راستہ اختیار کیا۔ یہ چھوٹا راستہ خلیج میں تیرتی ہوئی برف پر سے گزرتا تھا۔ جب ڈاکٹر اپنی کتا گاڑی کے ساتھ اس طرف کے ٹکڑے پر پہنچا تو اچانک ہوا کا رخ بدل گیا۔ برف کا تودہ آہستہ آہستہ سمندر کی طرف سرکنے لگا۔ صورت حال بہت نازک ہوگئی تھی۔ کتے گاڑی کے ساتھ ایک دم یخ بستہ پانی میں کود پڑے اور ساحل کی سمت تیرنے لگے۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی، کتے برفیلے پانی میں غوطے کھانے لگے، ڈاکٹر گرنفل نے صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے جلدی سے جیب میں سے چاقو نکالا اور کتوں کی رسیاں کاٹ ڈالیں۔ کتا گاڑی سمندر میں ڈوب گئی، لیکن ڈاکٹر اور کتے تیرتے ہوئے بڑی مشکل سے ایک دوسرے تودے پر پہنچ گئے۔ کتا گاڑی میں ڈاکٹر کے دوسرے گرم کپڑے پڑے تھے۔ گاڑی کے ساتھ وہ بھی سمندر میں ڈوب گئے، اس کے پاس بس وہی کپڑے تھے جو اس نے پہن رکھے تھے، لیکن وہ بھیگ چکے تھے اور ان میں سے برفیلا پانی نچڑ رہا تھا تلوار کی دھار جیسی تیز ہوا چل رہی تھی اور رات قریب تھی، سردی کے مارے ڈاکٹر کا جسم شل ہو رہا تھا، اس پر غنودگی طاری ہوگئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ سردی کی شدت سے وہ منجمد ہو رہا ہے اور اسی حالت میں تھوڑی دیر کے بعد اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

اس کے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت تھی، اس نے جیب سے چاقو نکالا اور تین کتے ہلاک کر دیئے۔ اس نے کتوں کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر رکھیں تاکہ ہوا کے رستے میں دیوار کھڑی کی جا سکے، اور ان کتوں کی کھال اپنے کپکپاتے ہوئے جسم کے گرد لپیٹ کر کتوں کی لاشوں کے سائے میں سکڑ کر لیٹ گیا، اتنے میں برف کا تودہ بھی سمندر میں حرکت کرنے لگا۔ جب صبح ہوئی تو اس نے کتوں کی ہڈیاں لیں اور انہیں ایک دوسرے پر باندھ کر ایک بانس سا بنا لیا۔ اور اس کے اوپر والے سرے پر اپنی قمیض باندھ کر زور زور سے چلانے لگا، وہ کئی گھنٹے اپنی قمیض کو لہراتا رہا۔ لیکن اسے امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دی۔ وہ ساحل سے بہت دور جا چکا تھا اور اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی جان بچنے کی بالکل کوئی امید نہیں تھی۔

اچانک اسے ایسا لگا کہ جیسے اس نے صبح کی دھوپ میں سمندر کے اندر ایک چپو لہراتا ہوا دیکھا ہے۔ نہیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ اس کی نظر کا دھوکا تھا، پھر اسے

دوبارہ چپو دکھائی دیا اب اس کا وہم یقین میں بدل گیا۔ ایک کشتی برف کا مقابلہ کرتی ہوئی اس تک آن پہنچی اور اس کی زندگی بچالی۔

کتنا عجیب وغریب تجربہ ہے، وہ کتنا عجیب وغریب انسان تھا۔

جب میں نے ڈاکٹر گرنفل کی انسانیت پر مبنی خدمات کی تعریف کرنی چاہی تو انہوں نے مجھ سے کہا، ''چھوڑیئے بھی! مجھے یونہی بڑا آدمی بنانے کی کوشش نہ کریں، یہ سب کچھ تو میں تفنن طبع اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کیا کرتا تھا۔''

ولجالمر سٹیفن سن

اسے جوتے کا چمڑہ بے حد لذیذ لگا۔

ایک بار میں تین گھنٹوں تک ایک ایسے شخص سے گفتگو کرتا رہا جس نے اپنی عمر عزیز کے گیارہ سال بحیرہ منجمد قطب شمالی کے راز دریافت کرنے میں صرف کر دیئے تھے۔

ان گیارہ سالوں میں چھ سال اس نے سوائے گوشت اور پانی کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس شخص کا نام سٹیفن سن ہے اس کی شریانوں میں قدیم بہادروں کا خون جاری ہے۔

سٹیفن سن پہلا مہم باز ہے جس نے بحیرہ منجمد شمالی کی چھان پھٹک کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ اپنے ہمراہ کھانے پینے کے لئے کچھ لے کر نہیں گیا تھا، محض شکار پر گزر اوقات کرتا تھا۔

جب اس نے پہلے پہل بحیرہ منجمد شمالی جانے کا اعلان کیا تو لوگ اسے پاگل سمجھنے لگے۔ اسکیموؤں نے اسے تنبیہ کی کہ وہ بھوک سے مر جائے گا، اسے اس چیز کی بالکل بھی پرواہ نہیں تھی، وہ ایک سائنس دان تھا اور بحیرہ منجمد شمالی کے ڈھکے چھپے بھیدوں کو منکشف کرنے کا خواہشمند تھا، اس لئے وہ اور اس کے ساتھی بندوقیں اور اسلحہ وغیرہ لے کر چل پڑے اور انہوں نے کئی ماہ بحیرہ منجمد شمالی میں تیرتی ہوئی برف پر گزار دیئے۔

ان میں سے برف کے بعض تودے ایک فٹ بال کے برابر تھے اور بعض ایک جزیرے جتنے بڑے تھے۔ بعض محض چند انچ موٹے تھے اور بعض سینکڑوں فٹ موٹے، یہ سب تودے ایک ایسے سمندر میں تیرتے پھر رہے تھے جو ایک میل سے تین میل گہرا تھا۔

اپنی مہم کے پہلے چالیس دنوں میں انہوں نے وہ سب کچھ کھا پی لیا جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اس کے بعد وہ سؤروں کا شکار کر کے گزر اوقات کرنے لگے۔ وہ پینے کے لئے پانی کہاں سے حاصل کرتے تھے؟ وہ آگ جلاتے اور برف کو پگھلا کر پانی پیتے۔

کہانی کا حیرت انگیز حصہ اب شروع ہوتا ہے۔ سٹیفن سن اور اس کے ساتھی سمندر میں تیرتی ہوئی برف پر سفر کرتے کرتے سات سو میل آگے چلے گئے اور جیسا کہ لوگوں کو یقین تھا کہ وہ بعد میں مر جائیں گے۔ اس کے برعکس ان کے وزن میں کئی پونڈ کا اضافہ ہو گیا اور انہوں نے اگلے تین مہینوں میں ایک وقت بھی کھائے بغیر نہ گزارا۔

سٹیفن سن نے مجھے بتایا کہ بعض اوقات انہیں محض کچا گوشت کھانا پڑتا تھا، بعض اوقات وہ ریچھ کے بال کاٹ کر بطور ایندھن استعمال کرتے اور اس پر گوشت پکاتے۔

ایک بار سٹیفن سن کے ایک ساتھی کے پاس تمباکو ختم ہو گیا۔ اسے تمباکو کی اتنی شدت سے خواہش ہوئی کہ وہ تنگ آ کر اس کپڑے کو چومنے لگا جس میں اس نے تمباکو باندھ رکھا تھا۔ پھر اس نے پائپ توڑ ڈالا اور اس کے ٹکڑے چوسنے لگا۔

مہم بازوں کی زیادہ تعداد اپنا سامان خورد و نوش کتا گاڑیوں پر لے کر جاتی ہے۔ وہ زیادہ تر ایک ہی وقت کا کھانا کھاتے ہیں اور ان کے کتوں کی بڑی تعداد بھوکوں مر جاتی ہے۔ لیکن سٹیفن سن شکار کے سہارے دن گزارتا رہا۔ گیارہ سال جو اس نے بحیرہ منجمد شمالی پر بسر کیے، اس دوران اس کا ایک کتا بھی بھوک کے مارے ہلاک نہ ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے کتے بھوک سے آشنا ہی نہ ہوئے تھے تو زیادہ موزوں ہوگا۔

بھیڑیوں سے کون نہیں خوفزدہ نہیں ہوتا؟ لیکن سٹیفن سن ان سے ہرگز نہ ڈرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کوئی درجن بھر کے قریب بھیڑیئے کھائے تھے اور اسے بھیڑیئے کا گوشت بہت لذیذ لگا تھا، وہ لوگ طرح طرح کا شکار کیا کرتے تھے، مثلاً جنگلی بطخیں، مرغابیاں، تیتر اور الو وغیرہ۔ ایک بار ان کے درمیان یہ سوال پیدا ہو گیا کہ سب سے لذیذ گوشت کس چیز کا ہوتا ہے۔ زیادہ ووٹ الو کے گوشت کے حق میں دیئے گئے۔

ایک بار انہیں کسی قسم کا شکار نہ ملا، جب بھوک نے شدت اختیار کی تو سٹیفن سن نے اپنے برفانی بوٹوں کا چمڑا کاٹ کر اسے نیم گرم پانی میں ابال کر کھا لیا اور آپ کو یہ سن کر

حیرت ہوگی کہ یہ چمڑا کھانے میں اسے بہت لطف آیا۔ اس کا یقین ہے کہ کچے چمڑے کا ابلا ہوا ٹکڑا خاصا لذیذ ہوتا ہے اور اس کا مزہ سؤر کے پاؤں جیسا ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ برفانی علاقوں میں اونی کپڑوں کی بجائے چمڑے کے کپڑے پہننا زیادہ موزوں ہے تاکہ بھوک کے وقت چمڑے کو ابال کر بطور غذا استعمال کیا جاسکے۔

اگر آپ کے گھر میں پرانے جوتے پڑے ہیں تو انہیں سنبھال کر رکھئے، کوئی پتا نہیں کہ کب آپ کو ان کی ضرورت پڑ جائے۔

جب گیارہ سال کے بعد سٹیفن واپس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ چھ سال تک محض گوشت پر گزر اوقات کرتا رہا ہے تو بہت سے ماہرین غذا نے اس کی یہ بات جھوٹ پر مبنی خیال کی، انہوں نے کہا کہ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ سٹیفن سن نے اپنے الفاظ کی عزت رکھنے اور سائنس کے مفاد کے پیش نظر اعلان کیا کہ وہ ایک سال تک محض گوشت پر زندہ رہ کر دکھائے گا، یہ تجربہ بڑے سائنٹیفک انداز میں کیا گیا۔ ہر ہفتے اس کے خون کا باقاعدہ تجزیہ کیا جاتا۔ ایک سال کے بعد معلوم پڑا کہ گوشت نے اس پر کسی قسم کا برا اثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ گرمیوں میں گوشت کی وجہ سے اسے زیادہ گرمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

سٹیفن سن کا ایک ساتھی بھی اس تجربے میں اس کا شریک تھا۔ تجربہ شروع کرتے وقت اس کے خون کا دباؤ بلند تھا، اس کے بال گرتے تھے اور اسے ہمیشہ زکام رہتا تھا۔ لیکن تین مہینوں کے اندر اندر اس کے خون کا دباؤ بھی ٹھیک ہوگیا اور بال گرنے بھی بند ہوگئے۔ زکام کی شکایت بھی جاتی رہی۔ اس ایک سال میں اس کے دانتوں کو بھی کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ سٹیفن سن نے مجھے بتایا کہ اسکیموز زیادہ تر گوشت کھاتے ہیں، اس لئے انہیں کبھی دانت کے درد کی شکایت نہیں ہوئی لیکن جونہی وہ ہمارے جیسا کھانا کھاتے ہیں، ان کے دانت گرنا شروع ہوجاتے ہیں۔

ہوشیار لوگ

برگھم ینگ

وہ فقط گیارہ دن سکول گیا اور انیسویں صدی
کی ایک نمایاں شخصیت بن گیا۔

مورمون فرقے کے عظیم قائد برگھم ینگ نے ستائیس عورتوں سے شادی کی تھی اور اس نے ان سب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ ہر روز ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھایا کریں اور ہر رات ایک ساتھ گھٹنوں کے بل جھک کر دعا مانگا کریں، اور وہ سالہا سال ان سے یہ کرواتا رہا اور اسے کسی بیوی نے ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہ دیکھا۔

معاف کیجئے، کیا میں نے یہ لکھ دیا کہ اس نے ”سب بیویوں کو ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھانے پر رضامند کر لیا تھا؟“ خیر میں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ مجھے یہ کہنا چاہئے تھا کہ ایک کے سوائے سب کو رضامند کر لیا تھا۔ ایک بیوی کے بال سنہرے، آنکھیں نیلی اور رنگ گلابی تھا، لیکن اس کا ذکر میں کہیں آگے کروں گا۔

برگھم کو اتنی بیویوں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا وہ شہوت پرست بوالہوس انسان تھا جسے جسمانی خواہشات چین سے بیٹھنے نہیں دیتی تھیں؟ بالکل نہیں۔ وہ بہت ہی باضابطہ اور بڑا مذہبی آدمی تھا۔ اس نے ایک بار اپنے وعظ میں کہا تھا، ”میں عورتوں کی صحبت میں رہنے کی اتنی کم پرواہ کرتا ہوں کہ دنیا میں غالباً کم ہی لوگ اس سلسلے میں مجھ پر سبقت رکھتے ہوں گے۔“

بہر حال مورمونوں نے ”عہد نامہ عتیق“ کو حرف بحرف قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے پڑھا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت

سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کی کئی بیویاں تھیں۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے براہ راست وحی کے ذریعہ سے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ کئی کئی عورتوں سے شادی کریں اور نسل انسانی کو پھیلائیں اور بڑھائیں۔

برگھم ینگ نے ایک بار وعظ میں کہا تھا کہ جو آدمی بیویوں کی کثرت کے عقیدے پر ایمان نہیں لائے گا، اس کی کبھی بخشش نہیں ہوگی اور اس نے کنواروں سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر انہوں نے شادی نہ کی تو ان کی بخشش نہیں ہوگی۔

برگھم نے محسوس کیا کہ اسے اپنی امت کے سامنے اچھی مثال قائم کرنی چاہئے، چنانچہ ایک دن وہ صبح صبح گھر سے نکلا اور دوپہر کے کھانے سے قبل اس نے دو عورتوں سے نکاح پڑھوا لیا۔ اس کے بعد اس نے جلدی جلدی چند لقمے کھائے اور رات کے کھانے سے قبل دو اور عورتوں سے شادی کر لی اور کہا کہ آج کا کام ختم ہوا۔

جس دن برگھم نے چار عورتوں سے شادی کی، وہ چوالیس سال کا تھا اور اس کی ان چار بیویوں میں سے ایک محض سترہ سال کی تھی۔ ایک بار اس نے دو بیواؤں سے شادی کی، انہوں نے اپنے متوفی شوہروں سے یہ عہد کیا تھا کہ عالم بالا میں وہ انہیں کے ساتھ زندگی بسر کریں گی، اس لئے برگھم نے واضح طور پر یہ شرط مان کر ان سے شادی کی تھی کہ اس دنیا میں وہ صرف اس کی بیویاں بنیں گی اور اگلے جہان میں دوبارہ اپنے شوہروں سے جا ملیں گی۔

بہت سی مورمون عورتیں برگھم ینگ سے شادی کرنا باعث فخر گردانتی تھیں۔ مثلاً ایلنزا برجیس ہی کو لے لیں جو سترہ سال کی انگریز لڑکی تھی، وہ دیوانہ وار اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اس نے عہد نامہ عتیق میں پڑھا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے سات سال بنا تنخواہ لئے کام کیا تھا، تب ان کی شادی ہوئی تھی، اس لئے اس نے بھی سات سال بنا کسی معاوضے کے برگھم کے گھر کام کرنے کی پیشکش کی، شرط یہ تھی کہ برگھم یہ وعدہ کرے کہ سات سال گزرنے کے بعد وہ اس سے شادی کر لے گا۔ برگھم ورمونٹ کے علاقے کا رہنے والا تھا، جہاں کے لوگ سودے بازی میں طاق ہوتے ہیں۔ یہ بھی بڑا اچھا سودا تھا۔ اس نے ایلنزا کی تجویز مان لی۔ سات سال بعد ایلنزا کو جنت کی کنجیاں دے کر برگھم نے

اپنی بیوی بنالیا۔

برگھم چوبیس عورتوں سے شادی کر کے جنجال میں پھنس گیا تھا، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ......خیر...... یہ جملہ آپ خود پورا کر سکتے ہیں، 1862ء کا ذکر ہے، جب امریکہ میں خانہ جنگی ہو رہی تھی، برگھم اکسٹھ سال کا تھا اور اس کی ان چوبیس فتوحات کے مدنظر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اب وہ آرام سے بیٹھ کر انہی کامیابیوں پر قناعت کرے گا۔ لیکن اس کی ملاقات ایک بلونڈ (عورت جس کے بال سنہرے یا لال، آنکھیں نیلی اور رنگ گلابی ہو) عورت سے ہوئی اور وہ بری طرح سے اس پر مرمٹا۔ اس کا نام امیلیا تھا۔ برگھم کا خیال تھا کہ امیلیا باقی سب عورتوں سے مختلف تھی، وہ یقینی طور پر مختلف تھی، سبھی عورتیں ایک دوسری سے مختلف ہوتی ہیں۔

امیلیا کی عمر پچیس سال تھی، وہ بہت دلآویز تھی۔ وہ پیانو بجانا جانتی تھی اور اپنا پیارا سا ننھا منا منہ کھول کر دریائے رہائن کے بارے میں گیت سنا سکتی تھی۔ برگھم کو اب اکثر کھانا کھانا یاد نہ رہتا، رات کو اسے نیند نہ آتی، اس نے امیلیا کی منت سماجت کی کہ وہ اس سے شادی کرلے، لیکن امیلیا کو عورتوں کی سب چالیں اور فریب آتے تھے۔ وہ ناک منہ چڑھا کر اپنی سنہری زلفیں جھٹک دیا کرتی جتنا زیادہ برگھم نے اصرار کیا، امیلیا کی پس و پیش میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہوتا گیا، آخر کار برگھم نے اسے جنت کی کنجیاں پیش کیں اور کہا کہ خدا کی مرضی یہی تھی کہ وہ برگھم سے شادی رچالے۔ چنانچہ امیلیا نے اس کی بات مان لی۔

یہاں سے جھگڑا شروع ہوا۔ اس نئی بلونڈ نے جو پیانو بجا اور دریائے رہائن کا گیت سنا سکتی تھی، دوسری بیویوں پر امارت جتانا شروع کر دی۔ کیا کہا؟ ان رذیل گھٹیا عورتوں کے ساتھ رہوں؟ نہیں جناب امیلیا تو نہیں رہے گی۔ اس نے برگھم کو حکم دیا کہ اس کے لئے مکان بنایا جائے۔ یہ مکان سالوں تک یوٹاہ ریاست کی قابل دید عمارات میں شامل رہا۔

کیا وہ میز پر انہی کم اصلوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے گی؟ جو اس کے بارے میں فضول باتیں کرتی رہتی تھیں، نہیں جناب، امیلیا تو نہیں کھائے گی۔ آخر شاہانہ انکسار سے کام لے کر وہ ایک ہی کمرے میں کھانا کھانے پر رضامند تو ہوگئی لیکن صدر مقام پر ان کی

چھوٹی سی علیحدہ میز چنی جاتی اور وہ برگھم کو بھی زبردستی اپنے ساتھ بٹھایا کرتی۔ افواہ یہ ہے کہ وہ تو چوزے کھاتی تھی اور باقی بیویاں سؤر کے نمک لگے گوشت پر گزارہ کرتی تھیں۔

برگھم کا بچپن سخت غربت میں گزرا تھا۔ لڑکپن میں اس نے اپنے چٹانی ہیٹ اپنے ہاتھوں سے بنائے تھے۔ چنانچہ وہ بیویوں کے سامنے ہر وقت کفایت شعاری کے متعلق تقریریں جھاڑا کرتا۔ اس نے انہیں اون لا کر دی اور کہا کہ اپنے موزے آپ بُنو اور انہیں دھمکایا کہ اگر انہوں نے مخمل کے ربن خریدے اور فیشن کے خبط پر اتنا زیادہ روپیہ خرچ کرنا بند نہ کیا تو وہ سب کو طلاق دے دے گا۔

کیا امیلیا بھی اپنے موزے بنتی تھی؟ وہ تو اس بات کا بڑا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ وہ پیانو بجاتی اور ریشم اور سارٹن کے کپڑے، عطر اور زیورات خرید کر لاتی اور اپنی ذاتی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر رعب ڈالنے کے لئے شہر بھر کا چکر لگایا کرتی۔ جب برگھم کی بیویاں تھیٹر جایا کرتیں تو امیلیا سب سے آگے بیٹھا کرتی اور باقی سب اس کے پیچھے۔

اگر برگھم کے گھر میں بندوق رکھنے کی اجازت ہوتی تو میرا خیال ہے کہ ایک نہ ایک صبح امیلیا مقتول پائی جاتی۔

برگھم نے ایک بار بوقت وعظ اعلان کیا کہ اگر اس کی امت کے کسی فرد کو کوئی پریشانی لاحق ہو، اور وہ اس سے مشورہ کرنے حاضر ہو تو برگھم بڑی خوشی سے اسے منشائے ایزدی سے آگاہ کر دے گا۔ ایک روز ایک پریشان حال بڑھیا نے برگھم کو کہا کہ اسے اس کے بارے میں خدا کی مرضی بتائی جائے کہ وہ سرخ لباس پہنے یا زرد۔ برگھم نے ایک منٹ غور کیا اور پھر کہا، ”بہر صورت زرد پہنو۔“ ایک اور بڑھیا آنسو بہاتی بھاگی بھاگی اس کے پاس آئی کیونکہ اس کے شوہر نے اسے ”جہنم میں جاؤ“ کہہ دیا تھا۔ برگھم نے اس کا بازو تھپکا اور سنجیدگی سے بولا۔ ”دیکھو مت جاؤ، مت جاؤ۔“

برگھم کے چھپن بچے تھے۔ اس کی محبوب بیوی کے دس بچے تھے، گیارہ بیویاں ایسی تھیں کہ جو اولاد سے بالکل ہی محروم تھیں۔ بعض اوقات برگھم کے یہاں ایک ہی ماہ میں تین بچے پیدا ہوتے۔ ایک بار اس کی دو بیویوں نے ایک ہی دن بچے جنے۔ جب اس کا آخری بچہ پیدا ہوا تو وہ اڑسٹھ سال کا تھا۔

میں شاید برگھم کی گھریلو زندگی کے بارے میں بڑی بے ادبی سے ادھر ادھر کی ہانک رہا ہوں۔لیکن برگھم کی زندگی کا ایک کہیں زیادہ دقیق پہلو ہے۔اس نے پوری زندگی میں صرف ساڑھے گیارہ دن اسکول پڑھا تھا۔اس کے باوجود انیسویں صدی کا ایک ممتاز لیڈر بن گیا تھا۔ابراہام لنکن سیکرٹری آف سٹیٹ ولیم سیوارڈ کا دعویٰ تھا کہ امریکہ میں برگھم ینگ سے بڑا مدبر کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔

کس طرح یہ ورمونٹ کا خود آموز انسان امریکی انسانوں کے لئے ایک حیران و پریشان اور ستم زدہ گروہ کو بیل گاڑیوں اور بند چھکڑوں میں خشک تپتے میدانوں کے پار لے گیا؟ کس طرح اس نے ان انسانوں کو ایک بنجر اور ان دیکھے بھالے علاقے میں پہنچا دیا۔ صحرا میں پانی پہنچا کر گلزار کھلایئے، کس طرح وہاں اس نے عظیم معاشی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور خود کو ایک نئے دین کا پیشوا بنایا اور اس دین کو پروان چڑھا کر ہرے بھرے درخت کی مانند پھیلا دیا۔ان کارناموں کی داستان ماضی کا ایک عظیم ڈرامہ ہے۔

بگ جم کا گروہ

انہوں نے اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کی خاطر ابراہام لنکن کی لاش چوری کر لی، لیکن اس جرم کے عوض قانون انہیں سزا دینے سے لاچار رہا۔

کفن چوری کا ذکر ہمارے ہاں اکثر آتا ہے۔گو اس کے واقعات شاذ ہی ہیں۔ لیکن کئی سال قبل امریکہ میں کچھ لوگوں نے ایک تابوت چرانے کی کوشش کی تھی۔یہ تابوت نہ کسی فرعون کی حنوط شدہ لاش کا تھا، جسے سونے اور جواہرات کے لالچ میں چرایا جاتا، اور نہ ہی چرانے والے کوئی پیشہ ور چور تھے۔یہ ایک سادہ تابوت کی کہانی ہے، جس میں امریکہ کے عظیم صدر ابراہام لنکن دفن ہیں اور اس کے چرانے والے اس زمانے کے جعلساز تھے، جنہوں نے حکومت وقت سے انتقام لینے کی خاطر یہ خطرناک قدم اٹھایا تھا۔

1876ء میں امریکی ریاست الی نوئے میں جعلسازوں کا ایک گروہ مصروف کار تھا۔یہ لوگ جعلی نوٹ اور بل وغیرہ چھاپ کر اصلی نوٹوں کے ساتھ بازار میں چلایا کرتے تھے اور اپنے ہنر اور تنظیم کے طفیل خاصے امیر ہو چکے تھے۔سرکاری روپے کی ساکھ کم ہونے کی وجہ سے بنک اور پولیس بڑے پریشان تھے۔آخر بہت سی تگ ودو کے بعد خفیہ پولیس اس جتھے کے ایک فرد بن بائڈ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔پولیس نے بائڈ کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا اس لئے جج نے اسے دس سال قید بامشقت کی سزا دی اور اسے جیل بھجوا دیا

گیا۔ اس گرفتاری کے ساتھ ہی اس جتھے کی ساری سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔ کیونکہ بائڈ ہی درحقیقت جعلی نوٹوں کے بلاک وغیرہ بنانے کا ماہر تھا۔ جب یہ لوگ اپنی ناجائز پونجی ختم کر چکے اور ان کی مالی حالت خراب ہونے لگی تو یہ سب جرائم پیشہ اپنے سردار ''عظیم جم'' کی سرکردگی میں بن بائڈ کو قید سے چھڑانے کی تدبیر کرنے کو جمع ہوئے۔ ان لوگوں کی شوریٰ نے ایک تجویز سوچی۔ اس کے مطابق وہ جرم کیا کہ جس سے سارے ملک میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور امریکہ کے ایک کروڑ باشندوں کا خون کھول اٹھا۔

اس تجویز کے مطابق ان جعلسازوں نے یہ پروگرام بنالیا کہ صدر لنکن کی نعش اور تابوت کو مدفن سے نکالا جائے اور راتوں رات تیز رفتار گھوڑا گاڑی کے ذریعے شمالی انڈیانا میں مشی گن جھیل کے کنارے لے جا کر اس دور افتادہ جگہ میں ریت کے ٹیلوں میں چھپا دیا جائے۔ جلد ہی گاڑی کے پہیوں کے نشان اڑتی ہوئی ریت سے ڈھک جائیں گے اور کسی کو کوئی سراغ نہیں مل سکے گا، جب اس حادثے کا علم حکومت اور لوگوں کو ہو گا اور سارے ملک میں ایک ہنگامہ مچ جائے گا تب یہ لوگ حکومت سے سودے بازی کریں گے کہ یا تو ان کے ساتھی کو رہا کر دیا جائے اور ساتھ ہی ضمانت کے طور پر دس لاکھ روپیہ دیا جائے، ورنہ لنکن کی نعش واپس نہیں ہو گی اس تجویز میں مجرموں کی ہوشیاری اس بات سے بھی عیاں ہے کہ انہیں علم تھا کہ رائج قانون میں کسی نعش کو چرانا جرم قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

اگر یہ سارا کام تجویز کے مطابق مکمل ہو جاتا تو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ زر ضمانت کا مطالبہ کرنے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے نعش چرائی ہے ایک ترکیب سوچی گئی، طے پایا کہ ایک اخبار خرید کر اس میں کاغذ کا ایک ٹکڑا پھاڑ لیا جائے اور بقایا حصے کو موقع واردات پر ارادتاً چھوڑ دیا جائے، قدرتی طور پر پولیس اخبار کے اس ٹکڑے کو بڑا اہم سراغ سمجھ کر محفوظ کر لیتی اور بعد میں اس کے ساتھ دوسرا ٹکڑا جو کہ چوروں کے پاس تھا پیش کر دینے سے یہ ضروری ثبوت مکمل ہو جاتا۔

6 نومبر 1876ء کی شام کو سب تیاریاں مکمل کر لینے کے بعد ''عظیم جم'' کے جتھے کے لوگ لنکن کے قصبہ سپرنگ فیلڈ جا پہنچے۔ یہی دن ریاستی انتخاب رائے کی رائے شماری کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور یہ اتفاق نہیں تھا بلکہ چوروں نے بڑی دانشمندی سے اس دن کو چنا

تھا۔ جب علاقے کی ساری آبادی رائے شماری میں مصروف تھی اور جیتنے والے امیدوار اور ان کے ہمدرد شہر کے گلی کوچوں میں ناچتے گاتے، شور مچاتے اپنی فتح کا اعلان کر رہے تھے اور تمام سرکاری افسر اور پولیس انتخابات کی نگرانی میں مصروف تھی تو اس وقت یہ چور آبادی سے دو میل دور باہر جنگل کے کنارے لنکن کے مقبرے میں اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کو اکٹھے ہو گئے۔

ابھی تک سارے حالات چوروں کے حق میں تھے اور انہوں نے کامیابی کے یقین سے سرشار ہو کر بڑے اطمینان سے اپنا کام شروع کیا۔ پہلے لوہے کا دروازہ کاٹا، پھر اندر داخل ہو کر قبر پر سے سنگ مرمر کا تختہ الگ کیا اور سب نے مل کر چوبی تابوت کو جس میں لنکن کی نعش محفوظ تھی، کھینچ کر باہر نکالنا شروع کر دیا۔

اس مرحلے پر ان کے ایک ساتھی سویگ لینز کو باہر بھیج دیا گیا تا کہ گھوڑا گاڑی کو ہانک کر قریب لے آئے۔ گاڑی کو مقبرہ سے قریباً دو سو گز دور ایک سوکھے ہوئے نالے میں چھپا کر تیار رکھنے کی ذمہ داری سویگ لینز نے لے رکھی تھی۔

اب لطیفہ یہ ہے کہ یہ شخص سویگ لینز بدمعاشوں کے اس گروہ کا پرانا ممبر نہیں تھا، بلکہ کچھ ہی عرصہ قبل ان میں شامل ہوا تھا اور درحقیقت وہ خفیہ پولیس کا ایک کارندہ تھا جو ان کی کارروائیوں کی مخبری کیا کرتا تھا۔

اس وقت اس نے کسی گاڑی یا گھوڑے کا انتظام نہیں کیا تھا بلکہ ان مجرموں کو عین موقع پر پکڑنے کے لئے مقبرے کے ایک حصے میں آٹھ مسلح سپاہی چھپا رکھے تھے۔ سویگ لینز سیدھا عمارت کے اس حصے کی طرف گیا اور پہلے سے مقرر کردہ اشارے کے مطابق دیا سلائی جلا کر سگار سلگایا اور آہستہ سے لفظ ''واش'' پکارا۔ اشارہ پاتے ہی آٹھوں سپاہی بھرے ہوئے پستول ہاتھوں میں لئے سامنے آ گئے اور قبر کو چاروں اطراف سے گھیرتے ہوئے چوروں کو للکارا اور اپنے آپ کو پولیس کے سپرد کر دینے کے لئے کہا۔ لیکن نہ تو گھپ اندھیرے میں کوئی آہٹ سنائی دی اور نہ ہی کسی نے جواب دیا۔ اس پر ان سپاہیوں میں سے ایک نے دیا سلائی جلائی اور اس کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ قبر والا کمرہ بالکل خالی پڑا ہوا تھا اور تابوت جو اس وقت تقریباً نصف باہر کھینچا گیا تھا، اسی طرح ٹکا ہوا تھا۔

اس ناکامی پر پولیس بڑی برافروختہ ہوئی۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر چوروں کی تلاش کی گئی لیکن ان کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ مقبرے کے باہر چاند کی ہلکی روشنی میں پولیس نے کچھ گولیاں بھی چلائیں۔ ہوا یوں تھا کہ سویگ لینز کے جانے کے بعد اس کے باقی ساتھی بھی عمارت سے باہر آگئے تھے اور عمارت سے ذرا دور ہٹ کر ایک جگہ اندھیرے میں کھڑے ہو کر اس کا انتظار کر رہے تھے، جب اچانک پولیس نے گھیرا ڈالا اور ان کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا تو بلا تاخیر وہ بلوط کے جنگل کو فرار ہو گئے اور پولیس کے ہوشیار جاسوس ہاتھ ملتے رہ گئے۔

تقریباً دس دنوں کے بعد پولیس نے ان کو شکاگو کے شہر میں گرفتار کر لیا اور انہیں ہتھکڑیاں لگا کر واپس لائے، ان کو جائے واردات یعنی سپرنگ فیلڈ میں لایا گیا، جہاں حوالات میں ڈال کر ان پر سخت پہرہ لگا دیا گیا۔

ابراہام لنکن کے بڑے بیٹے رابرٹ لنکن نے ان مجرموں کو سزا دینے کے لئے ملک کے قابل ترین وکلاء کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن جیسا کہ اس سے قبل لکھا جا چکا ہے، کسی نعش کا چرانا، کسی قانون کے تحت نہیں آسکتا تھا۔ ان فاضل قانون دانوں نے محض پچھتر ڈالر مالیت کے تابوت کو چرانے کے الزام میں مجرموں پر مقدمہ دائر کر دیا۔ چونکہ چوری کا عمل مکمل نہیں ہو سکا تھا اور بظاہر مقدمے کی بنیادیں بڑی کمزور تھیں، اس لئے کارروائی میں تاخیر ہوتی گئی اور بالآخر آٹھ ماہ کے بعد یہ کیس عدالت میں لایا گیا۔ اس اثناء میں عوام کا جوش سرد پڑ چکا تھا اور خواص کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ اس لئے پہلی پیشی پر بارہ ججوں میں سے چار نے مقدمہ خارج کر دینے کی سفارش کی لیکن استغاثہ کے زور دینے پر دو تین اور پیشیوں کی سماعت کے بعد ججوں نے متفقہ طور پر ان جعلساز چوروں کو ایک سال قید بھگتنے کے لئے جولیٹ جیل میں بھیج دیا اور یوں یہ قصہ اپنے انجام کو پہنچا۔

پی ٹی بارنم

وہ خود کو ”بکواس کا شہزادہ“ کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

امریکہ کی تاریخ کا سب سے بڑا مسخرہ اور سب سے زیادہ ہوشیار آدمی کون تھا؟ بلاشبہ دونوں کی اکثریت پی۔ ٹی۔ بارنم کے حق میں جائے گی۔ وہ دنیا کا مشہور ترین شومین تھا۔ بارنم خود کو ”بکواس کا شہزادہ“ کہلوانے میں فخر محسوس کرتا تھا، اس نے ”دنیا بھر کی بکواس“ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جب لوگ اسے دھوکے باز اور شیطان پکارتے تو وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا، لوگوں کو احمق اور الو بنانے میں اسے بہت مزا آتا تھا۔

سرکس کی دنیا میں بارنم کا نام سرفہرست آتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس نے دنیا کی پہلی سرکس ساٹھ سال کی عمر میں بنائی اور اس کا نام بارنم اینڈ بیلی سرکس رکھا۔ جب وہ ستر سال کا تھا تو اس سرکس نے کام کرنا شروع کیا۔

بارنم نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا میں ہر ایک منٹ کے بعد ایک خون چوسنے والا ظالم انسان پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ اس نے سرکس کے ذریعے سے اسی لاکھ پونڈ کمائے، لیکن جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، وہ کبھی خون چوسنے والا ظالم انسان نہ ثابت ہوا۔

درحقیقت وہ بڑا سادہ مزاج کا تھا۔ مثلاً جب وہ جوان تھا تو اس نے ایک دوسرے شخص کے ساتھ مل کر ایک ایسا مرکب بنانے میں پانچ ہزار پونڈ لگائے جسے استعمال کرنے سے گنجے سر پر دوبارہ بال اگ آتے تھے۔ لیکن بارنم کا ساتھی اس کا روپیہ لے کر یورپ بھاگ گیا اور بارنم کے پاس اس مرکب کا نسخہ چھوڑ گیا۔

بارنم نے ایک بار بائبل کے مصور نسخے فروخت کرنے کی کوشش کی، لیکن اس بار اس نے جو ایجنٹ مقرر کیا، وہ اسے دھوکا دے گیا اور اسے پائی پائی کا محتاج کر گیا۔

ایک بار اس نے آگ بجھانے والے آلے کے دائمی حقوق خرید لئے، لیکن وہ آلہ آگ بجھانے کے علاوہ ہر دوسرا کام کرتا تھا۔ آخر اس نے کلاک بنانے والی ایک فرم میں ایک لاکھ پونڈ لگا دیئے، لیکن وہاں سے بھی اس نے دھوکا کھایا اور اس کا دیوالیہ نکل گیا۔ اس خبر نے سارے امریکہ میں سنسنی خیز لہر دوڑا دی۔

آخر اپنا سارا اثاثہ کھو دینے کے بعد اس نے ''روپیہ کیسے کمایا جائے'' کے نام سے ایک تقریر لکھی۔ اس تقریر کے ذریعے وہ ایک رات میں دو سو پونڈ کماتا رہا۔ یہ تقریر اس نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی میں بھی کی۔

بارنم جب انگلینڈ میں تھا تو ایک بار اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس مکان کو جس میں کبھی شیکسپیئر رہا کرتا تھا، خرید کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جہاز کے ذریعے امریکہ لے جائے گا اور براڈوے میں اس کی نمائش کرے گا۔ اس کے اس اعلان پر سارے انگلینڈ میں حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگ اس کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

اپنی ساری چالاکی اور دانائی کے باوجود کبھی کبھار بارنم بہت شکستہ دل ہو جایا کرتا۔ ایک بار لیورپول میں اسے اپنا وطن یوں یاد آیا کہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

بارنم بڑا مخلص اور مذہبی آدمی تھا۔ ایک بار اس نے شراب کی برائیوں پر ایک تقریر سنی۔ اگرچہ وہ متوسط درجے کا شرابی تھا لیکن اس نے گھر آ کر اسی وقت شراب کی ساری بوتلیں توڑ دیں اور اپنے دل سے وعدہ کیا کہ آئندہ کبھی شراب نہیں پیئے گا۔ پھر وہ اپنے احباب کے گھر گیا اور انہیں بھی شراب چھوڑ دینے کی ترغیب دینے لگا۔ اس کے بیس دوستوں نے اس کی بات مان لی۔

جب بارنم برج پورٹ میں رہائش پذیر تھا تو اس نے اپنے مکان کے اوپر ایک جھنڈا نصب کر رکھا تھا تا کہ اس کے دوستوں اور ملاقاتیوں کو پتہ چل جائے کہ وہ گھر پر موجود ہے۔ اپنے عجائب گھر کی پبلسٹی کے لئے بارنم نے ایک ہاتھی اس مقصد کے لئے وقف کر دیا کہ جونہی ریل گاڑی ادھر سے گزرنے لگے، ہاتھی کو جوت کر ریل کی پٹڑی سے ملحقہ کھیتوں

میں فوراً ہل چلانا شروع کر دیا جائے گا۔ ہاتھی جوتنے والے نے بڑے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے ہوتے۔ بارنم نے اسے ریلوے ٹائم ٹیبل کی ایک کاپی دے رکھی تھی۔ جونہی ٹرین ادھر سے گزرنے والی ہوتی تو وہ ایک دم ہاتھی کو جوت کر ہل چلانے لگتا۔ تمام مسافر یہ عجیب و غریب منظر دیکھنے کے لئے کھڑکیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ سارے اخبارات نے یہ خبر جلی حروف میں شائع کی اور گھر گھر اس بات کا ذکر ہونے لگا، ہزاروں کسانوں نے وہ ہاتھی خریدنے کے لئے بارنم کو خط لکھے۔ اس طرح ہاتھی کے ساتھ ساتھ بارنم کے عجائب گھر کی پبلسٹی مفت میں ہوتی رہی۔

بارنم نے اپنی سوانح حیات 1855ء میں رقم کی اور پینتیس سال تک اس میں اضافے کرتا رہا۔ اس نے اپنی سوانح حیات کی ایک لاکھ جلدیں چار پنس فی جلد کے حساب سے خریدیں اور چار شلنگ فی جلد کے حساب سے فروخت کر دیں۔

ایک روز اس نے اپنے دفتر میں ایک بڑا سا صندوق دیوار کے ساتھ کیلوں سے نصب کر دیا اور اس کے اوپر یہ حروف لکھ ڈالے ''اسے پی۔ ٹی۔ بارنم کی موت سے قبل نہ کھولا جائے۔'' اس صندوق نے ایک سنسنی پیدا کر دی۔ اس کے ملازمین کا خیال تھا کہ بارنم ان کے لئے جائداد کا ایک حصہ چھوڑ کر جا رہا ہے، بہرحال جب صندوق کھولا گیا تو وہ اس کی سوانح حیات کی جلدوں سے بھرا پڑا تھا اور ایک کاغذ کے پرزے پر یہ درج تھا کہ یہ جلدیں اس کے ملازمین میں تقسیم کر دی جائیں۔

جب بارنم مرنے کے قریب تھا تو اخبار ''ایوننگ سٹار'' نے اس سے پوچھا کہ اگر اس کی موت سے قبل اس کی موت کی خبر شائع کر دی جائے تو کیا وہ اعتراض کرے گا؟ بارنم نے جواباً کہا۔ ''بالکل نہیں بلکہ مجھے خوشی ہوگی۔''

اگلے روز بارنم نے اپنی موت کی چار کالمی خبر پڑھی اور بڑا خوش ہوا۔

جب وہ فوت ہوا تو امریکی اخبارات نے اس خبر کو سب سے زیادہ جگہ دی۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس اعزاز پر کتنا خوش ہوتا۔

موت سے قبل اس کی زبان سے جو آخری الفاظ نکلے وہ یہ التجا تھی کہ اسے بتایا جائے کہ اس روز ''بارنم اینڈ بیلی'' سرکس کی آمدنی کیا تھی؟

جون لا

اس نے فرانس کو کنگال کر دیا لیکن جب مرا تو
اس کے پاؤں میں پھٹے ہوئے جوتے تھے۔

دوسو سال قبل کی بات ہے کہ جون لا نام کا ایک غریب الدیار اور بے یار و مددگار انگریز فرانس گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں وہاں کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ بارہ سال بعد کا ذکر ہے کہ جب وہ فرانس سے بھاگا تو ایک مشتعل ہجوم اس کی تلاش میں تھا جو اس کے خون کا پیاسا تھا، اور اگر وہ انہیں مل جاتا تو لوگ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔

اس شخص کی حرکات بڑی ولولہ انگیز اور حیرتناک ہیں۔ اس کی عجیب و غریب اسکیموں نے نصف قوم کو بھیک منگا بنا ڈالا۔ بارہ سال کی عمر میں جون لا بڑا ذہین ریاضی دان تھا جو ایڈنبرا میں اپنے پروفیسرز کو اپنی ذہانت سے ورطہ حیرت میں گم کر دیا کرتا تھا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ بانکوں جیسا رنگ برنگا لباس پہنا کرتا، اکڑ اکڑ کر چلتا اور منہ میں ہمیشہ نسوار رکھتا۔

جب وہ بیس سال کا ہوا تو ایک شیطانی جواری بن گیا۔ وہ تاش کے پتے جوڑنے میں بڑا ماہر تھا۔ چھبیس سال کی عمر میں اسے ایک بوڑھے آدمی کی محبوبہ سے محبت ہوگئی۔ بوڑھے نے جوش میں آ کر اسے ڈویل لڑنے کی دعوت دی۔ وہ لندن کی دھند زدہ گلیوں میں لڑے اور بالآخر جون لا نے اپنے رقیب کو ہلاک کر ڈالا۔

جون لا پکڑا گیا، اس پر قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی کی سزا ہوگئی۔ لیکن

پھانسی سے دو روز قبل وہ اپنے قید خانے کے محافظوں کو شراب پلا کر قید خانے کی چار دیواری پھلانگ کر باہر نکل گیا اور فرانس بھاگ گیا۔

فرانس ان دنوں ایک عجیب بحرانی شکنجے میں گرفتار تھا۔ لوگوں کے ہجوم بھوک اور نفرت سے دیوانگی کی کیفیت میں پیرس کی گلیوں میں پھرتے اور اپنے متوفی بادشاہ لوئی چہار دہم کے مجسموں کو زمین پر پٹکتے ہوئے نئی حکومت سے مطالبہ کرتے کہ انہیں بھوک اور تباہی سے بچایا جائے۔

اس موقع پر جون اپنی دراز زبان اور انقلابی خیالات لئے فرانس آن پہنچا۔ اس نے حکومت کو کاغذی نوٹ شائع کرنے کی ترغیب دی۔ قیمتیں ایک دم چڑھ گئیں۔ کاروبار زیادہ نفع دینے لگا۔ جون کو ایک نہایت ہی ذہین ہستی تصور کیا جانے لگا۔ اس نے حکومت کی مدد سے چین، ہندوستان، کینیڈا اور امریکہ میں تمام فرانسیسی آبادیوں سے تجارت کرنے کا اجارہ لے لیا۔

اب جون لا نے ایک نئی چال چلی۔ اس نے ایک کمپنی قائم کی اور اس کے حصص لوگوں کو فروخت کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان کچھ اتنا مسحور کن تھا کہ امیر غریب ہر کوئی اپنی پونجی لے کر جون کے گھر کی طرف بھاگا۔ چشم زدن میں اس کے گھر کے سامنے بہت بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور لوگ حصص خریدنے کے لئے آپس میں یوں دھینگا مشتی کرنے لگے کہ بہت سے لوگ پیروں تلے روندے گئے۔

ادھر حکومت نے کاغذی نوٹ شائع کرنے جاری رکھے اور ادھر جون لا اپنی کمپنی کے حصص فروخت کرتا رہا، ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہوگیا۔ ہر کوئی امیر نظر آنے لگا۔ نوکر چاکر بھی سٹاک ایکسچینج پر جوا کھیلتے اور دوسرے روز لکھ پتی ہو جاتے۔

ایک روز شہزادی تھیٹر میں گئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کے اگلے باکس میں اس کا سابقہ خانساماں بیش قیمت ہیروں کا لباس پہنے بیٹھا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے پیرس کی آبادی میں تین لاکھ افراد کا اضافہ ہو گیا ہوٹل اور سرائیں بارکوں کی طرح لوگوں سے پر ہو گئیں۔ افراط زر سے اشیاء کی قیمتیں چڑھ گئیں، تب خطرے نے اپنی ہلکی سی جھلک دکھلائی۔ کونٹی کا شہزادہ یہ صورتحال دیکھ کر غصے میں آ گیا اور

اس نے کاغذی نوٹوں کی تین گاڑیاں بھریں اور حکومت کے خزانے میں جا کر ان کے عوض سونا طلب کرنے لگا۔

دیکھا دیکھی لوگ حکومت کے بنک سے کاغذی نوٹوں کے عوض سونا نکلوانے لگے۔ جب سونا ختم ہو گیا تو بنک نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ جون لا حکومت کا مشیر تھا۔ حکومت نے اسے ملازمت سے الگ کر دیا۔ سارے فرانس میں ایک افراتفری پھیل گئی۔ جو لوگ جون لا کی کمپنی کے حصے خریدنے کو بیتاب تھے، اب اپنا روپیہ واپس لینے کے لئے اس کے گھر کو بھاگے۔ چشم زدن میں وہاں لوگوں کا اتنا بڑا ہجوم ہو گیا کہ رستے کی ٹریفک رک گئی۔ لوگ آپس میں جھگڑنے لگے جس کی وجہ سے چودہ آدمی ہلاک ہو گئے۔

آخر لوگوں نے مشتعل ہو کر دریچوں کے رستے جون لا کے گھر میں پتھر پھینکے اور اسے ہلاک کر دینے کی دھمکی دی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اور اپنا سارا خزانہ چھوڑ کر فرانس سے بھاگ اٹھا۔ حکومت نے اس کی کروڑوں کی جائداد ضبط کر لی، اس کی کتابیں، گھر کا فرنیچر اور دیگر سامان فروخت کر دیا۔ اس کی بیوی اور بچے کنگال ہو گئے۔ نو سال بعد جون لا جو کبھی بادشاہوں سے بھی زیادہ امیر تھا، وینک میں پائی پائی کو محتاج ہوا اور بے یار و مددگار دنیا سے اٹھ گیا۔ اس کے گھسے ہوئے جوتوں میں چھید پڑے ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ اپنے سرد کمرے میں کچھ لکڑیاں جلا کر اسے گرم کر سکتا۔

رابرٹ ایل رپلے

وہ ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہے لیکن اپنا ٹیلیفون نمبر اسے کبھی یاد نہیں رہا۔

ذرا اندازہ تو کیجئے کہ دنیا میں سب سے زیادہ خطوط کس شخص کے پاس آتے ہیں۔ کلارک گیبل؟ نہیں مائے ویسٹ؟ نہیں روڈلی والی؟ بالکل نہیں۔

میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جس کے پاس سال میں تقریباً دس لاکھ خطوط آتے ہیں۔ اور 1932ء میں تو اسے دنیا کے گوشے گوشے سے تیس لاکھ خطوط موصول ہوئے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہر روز آٹھ ہزار خطوط، یا پھر جتنی دیر آپ نے یہ جملہ پڑھنے میں لگائی ہے، وہ اٹھائیس خطوط حاصل کر چکا ہوگا۔ جتنے لوگ اسے جھوٹا یا دروغ گو کہتے ہیں، شاید ہی کسی دوسرے شخص کو اتنے لوگوں نے کہا ہوگا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنا یہ لقب پسند کرتا ہے۔

ہزاروں خطوط پر اس کا نام نہیں ہوتا لیکن وہ خطوط اسے مل جاتے ہیں۔ ان پر محض یہ لکھا ہوتا ہے۔ "یہ خط دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے شخص کو ملے۔" آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ ڈاک خانے والے ایسے تمام خطوط رابرٹ ایل رپلے کو بھیج دیتے ہیں۔

رابرٹ کا کام لوگوں کو حیران کرنا ہے اور اس کی گزر اوقات کا ذریعہ بھی یہی ہے۔ اس نے ایک بار انسانی جلد پر لکھا ہوا ایک خط مجھے دکھا کر حیران کر دیا۔ دوسری بار اس نے ایک انسانی بال پر لکھا ہوا خط دکھا کر حیران کے ساتھ پریشان بھی کر دیا۔ مجھے یقین نہیں

آتا تھا کہ لیکن جب میں نے وہ بال ایک دور بین کے نیچے رکھا تو اس کی عبارت صاف پڑھی جانے لگی تھی۔ اس پر لکھا تھا ''رابرٹ ایل رپلے کو خوش آمدید۔''

رپلے نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ اسے رونک کوڈ زبان میں لکھا ہوا ایک خط ملا تھا۔ یہ زبان آج سے ہزاروں سال قبل قزاق استعمال کیا کرتے تھے، اسے ایک دوسرا خط ملا جو ایک ایسی خفیہ زبان میں لکھا ہوا تھا جو آج سے سینکڑوں سال قبل جاسوسوں کی زبان ہوا کرتی تھی۔

پنسلوانیا کے ایک شخص نے رپلے کو چاول کے ایک دانے پر ایک خط لکھ کر بھیجا۔ ذرا خیال کیجئے، چاول کے ایک دانے پر سات سو پندرہ لفظ لکھے ہوئے تھے، یعنی دو ہزار آٹھ سو ساٹھ حروف، ظاہر ہے کہ انہیں آپ عام نظروں سے نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن دوربین کی مدد سے میں نے بآسانی پڑھ لیا تھا۔

اس نے مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر کے مجھے مزید حیران کر ڈالا کہ واٹرلو کی لڑائی واٹرلو کے مقام پر نہیں لڑی گئی تھی اور پنسلوانیا کا نام ولیم پن کے نام پر نہیں رکھا گیا تھا۔

اس نے مجھے یہ بتا کر میرے ہوش گم کر دیئے کہ اگر وہ مجھے نصف شب کو قتل کر دے اور جن لوگوں کو اس کے قتل کا پتہ چلے، اگر وہ بارہ منٹ کے اندر محض دو آدمیوں تک یہ خبر پہنچا دیں تو صبح ہونے سے قبل یہ خبر ساری دنیا میں پھیل چکی ہوگی۔

ایک دن رپلے نے مجھ سے کہا، ''اگر آپ اپنے گھر پندرہ مہمان مدعو کریں تو انہیں زیادہ سے زیادہ کتنے مختلف طریقوں سے بٹھانے میں آپ کو کتنا وقت لگے گا۔''

میں کچھ دیر زبانی جمع حساب کرتا رہا اور پھر اس سے کہا کہ زیادہ سے زیادہ یہی کوئی دو گھنٹے صرف ہوں گے۔

تب اس نے مجھے بتایا کہ اگر وہ پندرہ مہمانوں کو ایک کمرے میں مختلف طریقوں سے بٹھانے لگے تو اس کے پاس اتنے طریقے ہیں کہ ان سب کو استعمال کرنے کے لئے دو ارب سال کی ضرورت ہے۔

رپلے کے کارٹونوں کی طرح اس کی اپنی زندگی بھی ناقابل یقین ہے۔

اس کا باپ ایک بڑھئی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بتا دیا تھا کہ اگر وہ آرٹسٹ بنا تو

ساری زندگی فاقوں سے مرے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا کوئی اور کام کرے۔

رپلے نے جب ایک کارٹونسٹ کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تو اسے یکے بعد دیگرے تین اخبارات میں تلخ تجربات کا سامنا ہوا۔ ان تینوں اخبارات کے مالکوں نے تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد اسے ملازمت سے نکال دیا۔ لیکن آج وہ اتنا امیر ہے کہ ان تینوں اخبارات کے مالک اگر اپنا سارا سرمایہ جمع بھی کر لیں تو اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

رپلے نے ڈرائنگ کی کوئی تربیت حاصل نہیں کی تھی، لیکن آج دنیا میں اس کے کارٹونوں کی سب سے زیادہ نقل کی جاتی ہے۔

اس نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نپولین تک ہر بڑے آدمی کا مقبرہ دیکھنے کی خاطر ساری دنیا کی سیر کی ہے لیکن آپ مانیں نہ مانیں۔ وہ آج تک گرانٹ کے مقبرے پر نہیں گیا جو اس کے گھر سے محض تین میل کے فاصلے پر ہے۔

وہ ہمیشہ کردستان اور ٹانگانیکا جیسے دور افتادہ ممالک کی سمت مائل سفر رہتا ہے لیکن وہ گزشتہ چھ سال میں نیویارک میں واقع اپنے دفتر میں محض تین بار ہی گیا ہے۔ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اسے کاروبار سے نفرت ہے۔ اس نے اپنا کاروبار دوسرے لوگوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ اپنی ڈرائنگ ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو میں بناتا ہے۔

آپ کو وہ اسٹوڈیو دیکھنا چاہئے۔ کاغذ، کتب، ڈرائنگ اور دوسری اشیاء کے انبار اسٹوڈیو میں جگہ جگہ دکھائی دیں گے۔ یہ سب چیزیں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ ایسی بدنظمی میں تو میں ایک دن بھی کام نہیں کر سکتا۔ لیکن رپلے ایک آرٹسٹ ہے اور اسے ایسی بدنظمی سے پیار ہے، وہ سارا دن پاجامے میں ملبوس کام کرتا رہتا ہے۔

رپلے کو اسپورٹس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس نے ایک کتاب ہینڈ بال اور دوسری مکہ بازی پر لکھی ہے۔ وہ بیس بال کا پیشہ ور کھلاڑی بھی رہ چکا ہے۔ وہ نیویارک جائنٹس کلب کا باقاعدہ ممبر تھا۔ لیکن ایک بار بیس بال کھیلتے ہوئے اس نے اپنا بازو توڑ لیا۔ تب اس نے بیس بال چھوڑ کر کارٹون بنانے شروع کر دیئے۔

دسمبر 1918ء میں کرسمس سے ایک ہفتہ قبل وہ اپنے دفتر میں بیٹھا کوئی کارٹون بنانے کے متعلق سوچ رہا تھا لیکن اسے کوئی اچھا خیال نہیں سوجھ رہا تھا۔ دو گھنٹے گزر گئے، اس

کا ذہن ویسے کا ویسا خالی ہی رہا۔ وقت مقررہ سے قبل کوئی نہ کوئی کارٹون ضرور بنانا تھا۔ آخر تنگ آ کر اس نے دوڑوں کے بارے میں ایک کارٹون بنایا اور اس کا نام ''مانیں نہ مانیں'' رکھ دیا۔

یہ اس کی زندگی کا انقلابی پہلو ثابت ہوا۔ وہ سنسنی خیز طور پر کامیابی اور شہرت کی راہ پر چل نکلا، مگر یہ نعمتیں اسے فوری طور پر حاصل نہیں ہوئی تھیں۔

مانیں نہ مانیں کے تحت ہفتے میں ایک کارٹون دس سال تک بناتا رہا۔ ان دس سالوں میں لوگوں نے اس کے کارٹونوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ تقریباً ناکام ہو چکے تھے۔ رپلے نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ ''آپ شہرت کے لئے دس سال تک تابڑتوڑ محنت کرتے رہیں لیکن جب یہ حاصل ہوتی ہے تو دس منٹ بھی نہیں لگتے۔''

یہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا۔ ستمبر 1928ء میں اس نے ایک ایسا کارٹون بنایا جس نے لاکھوں آدمیوں کو حیران کر دیا۔

جب اس نے یہ کہا کہ بحر اٹلانٹک پر بغیر رکے پرواز کرنے والوں میں لنڈ برگ سترسٹھواں شخص تھا تو امریکہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگ اس کے خلاف ہو گئے اور کہنے لگے کہ وہ اپنے اس سفید جھوٹ کی معافی مانگے۔ لیکن رپلے نے اپنے دفاع میں کہا کہ لنڈ برگ سے کئی سال قبل براؤن اور الکاک بحیرہ اٹلانٹک پر نان سٹاپ پرواز کر چکے ہیں، اسی طرح برطانوی جہاز آر۔34 اور جرمن جہاز زیڈ آر۔3 جن میں اکتیس اور تینتیس مسافر بالترتیب موجود تھے بحیرہ اٹلانٹک پر سے پرواز کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے لنڈ برگ واقعی سترسٹھواں ہوا باز ہے جس نے اٹلانٹک پر بغیر رُکے پرواز کی ہے۔

ولیم رنڈولف ہرسٹ اس کا یہ کارٹون دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور اس نے رپلے سے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ اس کے ہر اخبار کے لئے ہر روز ایک کارٹون بنایا کرے گا۔

اس طرح رپلے شہرت کی منازل طے کرنے لگا۔

اس سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ وہ کتنے عرصے تک اسی طرح کارٹون بناتا چلا جائے گا۔ کبھی نہ کبھی تو اس کا مواد ختم ہو گا، لیکن اس کے پاس اتنا مواد موجود ہے کہ زندگی بھر ختم نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ اسے خط لکھتے ہیں اور اسے حیرت انگیز

حقائق سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ رپلے نے مجھے بتایا کہ اس کے لئے دس لاکھ آدمی کام کر رہے ہیں۔

رپلے میں جتنی عجیب وغریب باتیں موجود ہیں، شاید ہی دنیا کے کسی اور شخص کو معلوم ہوں گی لیکن اسے خود اپنے دفتر کا ٹیلیفون نمبر معلوم نہیں۔ پچھلے دنوں میں اس کے بارے میں چند باتیں جاننا چاہتا تھا۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دفتر فون کر کے ابھی یہ باتیں معلوم کر دیتا ہے۔ لیکن جب وہ فون کرنے لگا تو حیرت سے اس کا چہرہ عجیب سا ہو گیا، اسے اپنے دفتر کا فون نمبر معلوم نہیں تھا۔ آخر اسے اپنے سیکرٹری سے مدد لینی پڑی۔

ڈاکٹر ایس پارکس کاڈمین

دنیا کا نامور مذہبی مبلغ ہفتے میں دو تین جاسوسی ناول پڑھتا جب وہ پیدا ہوا تو ہمسائے کے ایک بزرگ کا خیال تھا کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکو نکلے گا۔

جب میں نیویارک میں ہوتا تو اپنے گھر سے ’’مشرقی دریا‘‘ عبور کر کے گاہے بگاہے گپ بازی کے لئے ایس پارکس کاڈمین کے پاس چلا جاتا۔ ڈاکٹر کاڈمین امریکہ کی ایک نامور شخصیت تھا۔ وہ ایک مشہور مبلغ اور ریڈیو مقرر تھا۔ اگر اسے براڈ کاسٹنگ کے بانیوں میں سے کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ وہ کئی سال تک ریڈیو پر باقاعدگی سے تقاریر کرتا رہا۔

اگر آپ خود کو بڑا مصروف انسان سمجھتے ہیں تو ذرا غور سے سنئے کہ ڈاکٹر کاڈمین ایک دن میں کیا کچھ کرتا تھا۔

وہ صبح سات بجے اٹھتا۔ اپنے سٹینو کو بیس تیس خط لکھواتا۔ پھر پندرہ ہزار الفاظ پر مشتمل اخبار کے لئے ایک مضمون لکھتا، کوئی وعظ تیار کرتا یا زیر تحریر کسی کتاب کا کوئی مضمون لکھتا۔ چھ سات گرجا گھروں کو جاتا۔ دو تین اجلاس میں شرکت کرتا۔ ایک یا دو تقاریر کرتا۔ گھر واپس آتا۔ کوئی نئی کتاب ایک ہی نشست پر پڑھ ڈالتا اور پھر رات کے دو بجے سونے کی تیاری کرنے لگتا۔

اس قسم کے پروگرام سے میرا تو سر چکرانے لگتا۔ لیکن ڈاکٹر کاڈمین مہینوں بلکہ برسوں اس پروگرام پر قائم رہا۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا کہ وہ اتنے مصروف پروگرام پر کس طرح کاربند رہتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا ’’بالکل آسان ہے، میں پہلے سے منصوبہ بندی کر لیتا ہوں۔‘‘

ڈاکٹر کاڈمین نے مجھے بتایا کہ کام کرنے کے سلسلے میں اس نے گلیڈسٹون سے ایک بہت قیمتی سبق سیکھ رکھا تھا۔ جب گلیڈسٹون برطانیہ کا وزیراعظم تھا تو اس نے اپنے دفتر میں چار میز لگا رکھے تھے۔ ایک میز پر وہ ادبی کام کرتا تھا، دوسری پر سیاسی، تیسری پر خط و کتابت اور چوتھی پر مطالعہ کی کتب دھری ہوتی تھیں۔ گلیڈسٹون کا تجربہ تھا کہ مختلف اقسام کے کام کرنے سے انسان بیزار نہیں ہوتا اور کام بھی زیادہ کر سکتا ہے، اس لئے وہ ایک میز پر کام کرنے کے بعد دوسری میز پر منتقل ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر کاڈمین بھی یہی نسخہ استعمال کرتا اور اس طرح کام سے بیزار ہونے کی بجائے ہر وقت تازہ دم رہتا۔

اس کا مطالعہ بھی مختلف موضوعات کی کتب پر مشتمل ہوتا۔ اگر آپ کے خیال میں ڈاکٹر ہر وقت مذہبی کتب پڑھتا رہتا تھا تو آپ غلطی پر ہیں۔ کھانے کی طرح وہ مطالعے میں بھی ورائٹی کا خیال رکھتا تھا۔ اس لئے وہ ہفتے میں دو تین جاسوسی ناول ضرور پڑھتا۔ شرلاک ہومز کے ناول اسے بڑے پسند تھے اور اس کے نزدیک ’’باسکرولز کا شکاری کتا‘‘ بہترین جاسوسی کہانی ہے۔ ایک دن میں اس کے ہاں گیا تو اس کے مطالعہ کی میز پر چار مختلف اقسام کی کتب پڑی تھیں۔ ایک خوراک کے بارے میں تھی، دوسری ڈاکٹر گرنفل کی ’’رومانس آف لیبراڈور‘‘ تھی۔ تیسری ’’لوئی چہار دہم کے دربار کی یادگاریں‘‘ تھی اور چوتھی حال ہی میں چھپی ہوئی ایک نئی کتاب تھی۔

اس شخص میں مجھے جو بات سب سے زیادہ حیرتناک دکھائی دی ہے وہ یہ ہے کہ جب یہ گیارہ سال کا تھا تو کوئلے کی کان میں کام کیا کرتا تھا۔ دس سال تک وہ روزانہ آٹھ گھنٹے زیر زمین کام کرتا رہا تاکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کا پیٹ پال سکے۔

اس وقت کسی کو خیال تک نہیں تھا کہ وہ تعلیم حاصل کر سکے گا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ اس کا شمار امریکہ کے چند اعلیٰ پڑھے لکھے لوگوں میں ہونے لگا۔ اس نے ایک بار مجھے

بتایا کہ انگریزی ادب کی ہر شاخ کے بارے میں وہ مناسب سمجھ بوجھ رکھتا ہے۔ جب وہ کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا تو کوئلہ گاڑیوں میں لادنے کی وجہ سے اسے دو تین منٹ ستانے کو مل جایا کرتے تھے، وہ فوراً اپنی جیب سے کتاب نکال کر پڑھنے لگتا تھا۔ آپ جانتے کہ کوئلے کی کان میں کتنا اندھیرا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ پرانی لالٹین کی روشنی میں پڑھتا تھا۔ دو منٹ میں بھلا کوئی کتنا پڑھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہر وقت جیب میں کتاب رکھتا اور بعض اوقات کھانے کا وقفہ بھی کتاب کے مطالعے میں گزار دیتا۔

وہ جانتا تھا کہ کوئلے کی کان اور اس مکروہ زندگی سے نجات حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے، کتابیں پڑھے۔ اس لئے ان دس سالوں میں جو کتاب بھی اس کے ہاتھ لگی، اس نے پڑھ ڈالی۔ ان دس سالوں میں اس نے ایک ہزار سے زیادہ کتب پڑھیں۔ دس سال کے بعد اس کے علم میں اس قدر اضافہ ہو چکا تھا کہ اس نے آنرز کے ساتھ امتحان پاس کیا اور ریکمنڈ کالج کی طرف سے اسے وظیفہ بھی ملا۔

ہر اتوار تقریباً پچاس لاکھ لوگ ڈاکٹر کاڈمین کا وعظ سنتے، اس کا شمار دنیا کے مشہور ترین مبلغوں میں ہوتا تھا، دنیا میں ہر جگہ لوگ اس کا وعظ سنتے۔ ایڈمرل بارڈ نے ایک بار اسے قطب جنوبی سے ایک ریڈیو پروگرام بھیجا اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی بھیجا کہ قطب جنوبی میں وہ اور اس کے ساتھی اس کے وعظوں سے بیحد لطف اندوز ہوتے تھے۔ لیکن جب ڈاکٹر کاڈمین پہلے پہل امریکہ آیا تو اسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک سو بیس پونڈ سالانہ پر ایک گرجے میں پادری کی ملازمت ملی۔ گاؤں کے لوگ اتنے غریب تھے کہ یہ تنخواہ دینے کی سکت بھی نہیں رکھتے تھے اور اکثر روپے کے بدلے میں اسے پھل وغیرہ دیئے جاتے۔ ایک بار ایک کسان اسے گھاس کا ایک گٹھا دے گیا۔

ڈاکٹر کاڈمین شروپ شائر کے ایک چھوٹے سے قصبے اولڈ پارک میں پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت ایک ہمسائے نے پیشگوئی کی تھی کہ وہ بڑا ہو کر ڈاکو بنے گا۔

ڈاکٹر کاڈمین نے مجھے بتایا کہ جس شخص کی زندگی سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا وہ ابراہام لنکن تھا۔ ٹھیکرے اس کا محبوب ناول نگار تھا اور ورڈز ورتھ اس کا محبوب شاعر تھا۔

لوول ٹامس

وہ دنیا کا واحد شخص ہے جس نے پہلے ہوائی جہاز اور بعد میں کار چلانا سیکھی۔

چند سال قبل کی بات ہے کہ ویسٹرن یونین ٹیلیگراف کمپنی نے ریڈیو پر اعلان کیا کہ فلاں شام کو جن لوگوں نے لوول ٹامس کو تار بھیجنے ہوں، بالکل مفت بھیج سکتے ہیں۔ اس شام تمام امریکہ کے تار بجنے لگے اور لوول ٹامس نے اس شام ایک گھنٹے میں اڑھائی لاکھ تار حاصل کئے۔

جن شخصیات سے میں آج تک ملا ہوں، لوول ٹامس ان میں سب سے زیادہ غیر معمولی مزاج کا حامل ہے۔ اس نے اس قدر کتب لکھی ہیں کہ بہت سوں کا نام بھی اسے یاد نہیں رہتا۔ ہر وہ ملک جہاں انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے، اس کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

میں نے لندن میں اکثر دیکھا ہے کہ جس ہال میں لوول ٹامس نے تقریر کرنا ہوتی ہے لوگ وہاں گھنٹوں پہلے میل میل لمبی قطار باندھے ٹکٹ خریدنے کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ وہ لوول ٹامس کی تقریر اور اس کے مسحور کن تجربات سننے کے لئے بے تاب ہوتے ہیں۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ لوول ٹامس مختلف نوعیت کے کام کر کے اپنی گزر اوقات کیا کرتا تھا، وہ سونے کی کانوں میں ملازم رہ چکا ہے وہ بیلوں کو سدھاتا رہا ہے۔ وہ اخبارات کا

رپورٹر اور ایڈیٹر رہ چکا ہے، اس نے پروفیسری بھی کی ہے۔ اس نے یورپ، ایشیا، افریقہ، الاسکا اور آسٹریلیا میں سالوں جادہ پیمائی کی ہے۔ اس نے پرنس آف ویلز کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کیا ہے اور وہ پہلا امریکی ہے جسے افغانستان جیسے ''خطرناک'' ملک میں جانے کی اجازت ملی تھی۔

وہ اور اس کے آدمی دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی، فرانسیسی، بیلجیمی، اطالوی، امریکی اور عربی فوجوں کی محاذ جنگ پر فلمیں اتارتے رہے ہیں۔ جب وہ ہندوستان کے بارے میں فلم بنانے وہاں گیا تو وہاں کی حکومت نے اس کے لئے ایک خاص ٹرین، ایک سٹیمر اور کئی ہاتھی وقف کر دیئے۔

پہلے پہل وہ پرنسٹن یونیورسٹی کے شعبہ فنِ تقریر میں پڑھایا کرتا تھا۔ میرے خیال میں وہ آج کا بہترین مقرر ہے۔ وہ امریکہ کے لاکھوں سامعین کے لئے ریڈیو سے محض خبریں ہی نشر نہیں کرتا بلکہ اس کی آواز دنیا بھر میں سنی جاتی ہے۔ جب کبھی اس نے تقریر کرنا ہوتی ہے ہزاروں لوگ جوق در جوق کھنچے چلے آتے ہیں۔ مثلاً ایک بار التونا (پنسلوانیا) میں اسے تقریر کرنا تھی۔ سات ہزار لوگ اس کی آواز کی حدود میں آنے کو بے تاب تھے۔ گذشتہ پندرہ سال سے وہ جہاں کہیں بھی تقریر کرتا ہے ہجوم کی یہی حالت ہوتی ہے۔

آپ کے خیال میں وہ کتنی عمر کا ہوگا؟ اس قسم کے شاندار ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی عمر ستر سال سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن وہ محض پچاس سال کا ہے اور اس کے سر کا ایک بھی بال سفید نہیں ہوا۔

میری ملاقات اس سے بیس سال قبل ہوئی تھی جبکہ وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں ایک طالبعلم تھا۔ ان دنوں وہ قانون میں ڈاکٹریٹ کر رہا تھا۔ اس وقت نہ تو اس کے پاس دولت تھی اور نہ ہی شہرت۔ کامیابی نے اس پر کس قسم کا اثر چھوڑا ہے؟ کیا وہ بدل گیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے اندر آج بھی پہلے جیسا عجز اور انکسار ہے۔

نیویارک سے ستر میل دور اس کا اپنا ایک فارم ہے جو ساڑھے تین سو ایکڑ اراضی پر مشتمل ہے۔ اگرچہ نیویارک میں اس کے اپنے کئی مکان موجود ہیں۔ لیکن وہ ہر شام ریڈیو پر خبریں نشر کرنے کے بعد اپنے اس فارم پر چلا جاتا ہے۔ وہ ریڈیو سے پورے سات بجے

خبریں ختم کرتا ہے۔ اس کے فارم کو جانے والی آخری ریل گاڑی گرینڈ سنٹرل اسٹیشن سے سات بج کر پانچ منٹ پر روانہ ہوتی ہے۔ ریڈیو سٹیشن سے نکل کر وہ خواہ کتنی ہی تیز کار کیوں نہ چلائے، پھر بھی وقت پر سٹیشن نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے نیویارک سنٹرل ریلوے نے یہ حکم جاری کر رکھا ہے کہ وہ ٹرین لوول ٹامس کے بغیر سٹیشن سے حرکت نہ کرے۔

جب وہ دس سال کا تھا تو وہ کالوروڈا کے جواخانوں میں اخبار بیچا کرتا تھا، وہاں اچھے سے اچھا لڑکا بھی خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن ٹامس نہ تو سگریٹ اور شراب کا عادی ہوا اور نہ ہی کبھی اُس نے جوا کھیلا۔ درحقیقت وہ ایک شاعر کی طرح کی خاموش زندگی گزار رہا ہے، وہ اپنے گھر اور اپنے بیوی بچوں میں بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ اس نے کالوروڈا کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔

اسے ایک بار تقریر کرنے کا معاوضہ ایک سو پونڈ ملتا ہے۔ اس کے باوجود روزمرہ زندگی میں وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کی خبریں سننے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ سردیوں میں اپنے کمرے میں آتش دان کے سامنے فرش پر لیٹ جاتا ہے اور اپنے کتے کو اپنے پہلو میں لٹا کر پہروں شعلوں کو گھورتا رہتا ہے۔ اس حالت میں مَیں نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔

اس کا شمار دنیا کے مصروف ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اسے کبھی جلدی میں نہیں دیکھا۔ وہ بڑا پرسکون رہتا ہے۔ مثلاً ایک بار میں چند دوسرے افراد کے ہمراہ اس کے فارم پر گیا ہوا تھا۔ واپسی کی صبح گاڑی چھوٹنے میں محض سات منٹ تھے اور ہم ابھی تک فارم میں تھے۔ سارے لوگ جلدی کی رٹ لگا رہے تھے۔ لیکن لوول ٹامس بڑی پرسکون حالت میں تھا۔ اس نے بڑے آرام سے آتش دان میں آگ جلائی۔ ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا اور پھر سٹیشن کو چل پڑے۔ جب اسٹیشن کو پہنچے تو گاڑی چھوٹنے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا۔

لوول ٹامس شاید دنیا کا واحد شخص ہے جس نے کار چلانے سے قبل ہوائی جہاز چلانا سیکھا تھا۔

ول روجرز

وہ بڑی خراب انگریزی بولتا اس کے باوجود
تقریر کرنے کا معاوضہ ایک پاؤنڈ فی سیکنڈ کے
حساب سے لیتا۔

آپ کے خیال میں امریکہ میں سب سے زیادہ روپیہ کون کماتا ہے؟ میرا مطلب ان تاجروں سے نہیں جو کاروبار میں سرمایہ لگا کر دولت کماتے ہیں، میرا مطلب اس شخص سے ہے جو کسی قسم کے کاروبار میں سرمایہ لگائے بنا محض اپنی صلاحیت کے زور پر روپیہ کماتا ہے۔

چارلی چپلن؟ نہیں۔ چارلی چپلن نے گزشتہ کئی سال سے کوئی فلم نہیں بنائی۔ اس کے علاوہ وہ تو اب کاروباری آدمی ہے۔ اس کی اپنی فلم کمپنی ہے۔

گریٹا گاربو؟ نہیں۔

روڈی ویلی؟ نہیں۔

یہ سب سے زیادہ روپیہ کمانے والا ایک ایسا شخص تھا جس نے کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ وہ بڑی خراب انگریزی بولتا تھا، پھٹے پرانے کپڑے پہنتا تھا۔ بہت آلکسی تھا۔ مقررہ وقت پر کبھی نہیں پہنچتا تھا اور چیونگم کا بڑا شوقین تھا، اس کا نام ول روجرز تھا۔

اس نے تین فلمیں بنانے کا معاوضہ 55000 پونڈ فی سال کے حساب سے لیا تھا۔ اسے اخبار میں ایک کالم لکھنے کے عوض 85 پونڈ یومیہ ملتے تھے۔ وہ ایک مضحکہ خیز تقریر کرنے کے لئے 200 پونڈ طلب کرتا تھا۔ ریڈیو پر تقریر کرنے کا معاوضہ اسے 66 پونڈ فی منٹ کے حساب سے ملتا تھا۔

ول روجرز الیکشن ڈے میں پیدا ہوا تھا اور اس نے کانگرس کے بارے میں بہترین لطائف گھڑ کر ایک لاکھ پونڈ کمائے تھے۔ لیکن بذات خود اس نے کبھی ووٹ نہیں دیا تھا۔ درحقیقت وہ کسی جگہ بھی ٹک کر نہیں بیٹھا تھا۔ اس لئے اس کا ووٹ رجسٹرڈ نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی وہ ووٹ ڈالنے کے حق میں نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کسی جذباتی تعصب کے بغیر اپنی بات کہنے کا عادی تھا۔

وہ امریکہ کی ریاست میں پیدا نہیں ہوا تھا، اس کا تعلق حبشی علاقے سے ہے۔ وہ اولوگاہ سے چار میل دور ایک چھوٹے سے مکان میں پیدا ہوا۔ وہ مکان ابھی تک موجود ہے۔ اس مکان سے تھوڑے فاصلے پر محکمہ تعمیرات عامہ نے یہ بورڈ لگا رکھا تھا۔ ''اگر آپ نے ول روجرز کا مکان دیکھنا ہو تو اس طرف جائیں۔'' سیاح جوق در جوق اس کا مکان دیکھنے کو جایا کرتے تھے۔ وہ یادگار کے طور پر اس مکان کی مختلف اشیاء اڑا لے جانے لگے۔ آخر لاچاری کے عالم میں وہ بورڈ وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

ول روجرز کی ماں اسے ایک میتھوڈسٹ پادری بنانے کی خواہشمند تھی۔ زندگی کے ابتدائی سالوں میں ول روجرز خود بھی پادری بننے کا خواہش تھا۔ اس کی ماں میتھوڈسٹ تھی اور وہ خود بھی۔

اس کی ماں اور باپ دونوں کی رگوں میں تھوڑا تھوڑا حبشی خون تھا، اس کی والدہ میں 1/4 اور باپ میں 1/8۔ ول روجرز ریاضی میں ہمیشہ کمزور رہا تھا۔ وہ کبھی حساب نہ لگا سکا کہ اس کے اندر حبشی خون کتنی مقدار میں تھا۔

جب ول روجرز پہلی بار نیویارک آیا تو ایک مال گاڑی میں بیٹھ کر آیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سارے مویشی لایا تھا۔ وہ رستہ بھر مویشیوں کو چارہ ڈالتا اور پانی پلاتا آیا تھا۔ اوکلاہاما سے نیویارک تک اس نے مال گاڑی کے گھٹیا ڈبوں میں سفر کیا۔ جب وہ اپنے کاؤبوائے والے ہیٹ اور دیہاتی کپڑوں کے ساتھ براڈوے سے گزر رہا تھا تو لوگ اسے دیکھ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک آدمی نے چپکے سے اس کے عقب میں آ کر اس کا ہیٹ اتار لیا اور دوسرے لوگ قہقہے لگانے لگے۔ جب وہ آخری بار نیویارک میں آیا تو ہوائی اڈے پر لوگوں کا ایک ہجوم اس کے استقبال کے لئے جمع تھا اور آٹوگراف کے شوقین اس پر

ٹوٹ پڑے تھے۔

جوانی کے دنوں میں روجرز دنیا کی سیر کرنا چاہتا تھا۔اس لئے وہ جنوبی امریکہ چلا گیا اور وہاں چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے لگا۔ جب بوائر جنگ چھڑی تو وہ جنوبی افریقہ چلا گیا اور وہاں برطانوی رسالے کے لئے گھوڑے سدھارنے پر ملازم ہوگیا۔

جب جنگ ختم ہوگئی تو اس کی مالی حالت بگڑنے لگی۔آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ وہ مجبوری کے عالم میں سپاہیوں کے ساتھ بیرکوں میں رہنے لگا۔ باورچی بچا کھچا کھانا اسے دے دیتا۔امریکہ واپس جانے کی نیت سے وہ ایک چھوٹی سی سفری سرکس کے ساتھ ہولیا۔ وہ سرکس میں چھوٹے موٹے تماشے بھی کرنے لگا۔یہیں سے اس کی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔

بعد میں اس نے بیٹی بلیک سے شادی کرلی۔ جب اس نے پہلی بار بیٹی بلیک کو دیکھا تو اس وقت وہ اوکلاہاما میں کلئر مور کے پورچ کے سامنے بیٹھی ہوئی سوڈا واٹر پی رہی تھی۔روجرز نے ان دنوں نیا نیا سائیکل خریدا تھا۔وہ بیٹی بلیک کے سامنے سائیکل کے کچھ کرتب دکھاتا رہا اور پھر جان بوجھ کر گر پڑا۔س کے سر پر چوٹ آئی۔ بیٹی بھاگی بھاگی آئی اور اس کے سر کا خون صاف کرنے لگی۔اس طرح ان دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی۔

ول روجرز عجیب وغریب حرکات کا مالک تھا۔وہ دنیا کے بلند ترین طبقے میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔بادشاہ اور ملکہ اسے اپنے یہاں مدعو کیا کرتے تھے۔اس کے باوجود وہ لباس کے معاملے میں بڑا بے پرواہ ثابت ہوا تھا۔جب اس نے فلم میں کام کرنا ہوتا تھا اور وہاں سے کسی منظر میں کام کرنے کے لئے سوٹ وغیرہ پہننا پڑتا، تو بہ امر مجبوری پہن لیتا۔اس نے اپنی جیب میں ایک پونڈ سے زیادہ رقم کبھی نہیں رکھی تھی۔وہ اپنی کار بھی خود چلایا کرتا تھا۔اس نے شوفر رکھنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔اس نے کبھی سگریٹ نہ پیا تھا۔

وہ اکثر میلے اور پرانے کپڑے پہنے رہتا۔ہالیووڈ اور لاس اینجلز آتے وقت اس نے کبھی اہتمام نہیں کیا تھا۔

جب وہ ہوائی جہاز کے ایک حادثے کا شکار ہوگیا تو اس کی موت کا ساری دنیا کو بے حد افسوس ہوا۔